

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
مَجْلَدِ تَحْقِيقِ  
(الجلد: ۳۹)

# سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

شمارہ ۳

جلد ۳۵

محرم الحرام - ربیع الاول ۱۴۴۸ھ جولائی - ستمبر ۲۰۲۶ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین - ڈاکٹر اسرار احمد راجہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر عارف رشید

مجلس ادارت:

حافظ عاکف سعید - حافظ عاطف وحید  
ڈاکٹر محمد رشید ارشد - مؤمن محمود  
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

مدیر:

ڈاکٹر البصیر احمد

نائب مدیر:

حافظ خالد محمود خضر

یکے لطبعات  
مرکز انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501

ویب سائٹ: [www.tanzeem.org](http://www.tanzeem.org)

ای میل: [publications@tanzeem.org](mailto:publications@tanzeem.org)

سالانہ ذریعہ تعاون: 600 روپے، فی شمارہ: 150 روپے

مطبع: آر آر پرنٹرز، سکیاں روڈ لاہور

# اس شمارے میں

## حرفِ اوّل

مسلمانوں کے کلاسیکی علوم کی اہمیت

3 ڈاکٹر البصیر احمد

## فکر و نظر

مکالمے کا واہمہ

11 ڈاکٹر محمد رشید ارشد

## فہم القرآن

ترجمہ قرآن مجید، مع صرفی و نحوی تشریح

33 پروفیسر حافظ احمد یار

## تذکرہ و تدبیر

ملاک التاویل (۲۵)

47 ابو جعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی

## تعلیم و تعلّم

تعلیم کے اولین اصول (۴)

از: ڈاکٹر محمد رفیع الدین

62 مترجم: پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان

## ایمانیات

مباحث عقیدہ (۲۷)

70 مؤمن محمود

## فکر و فلسفہ

مبادی علم کلام (۵)

85 سعید عبداللطیف فودہ/مکرم محمود

## رپورتاژ

تعارف و تبصرہ رجوع الی القرآن کو رسم کی تقریب اسناد

90 مرتضیٰ احمد اعوان

## کتاب نما

تعارف و تبصرہ

93 احمد علی محمودی

## بیان القرآن

MESSAGE OF THE QURAN

112 Dr. Israr Ahmad



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مسلمانوں کے کلاسیکی علوم کی اہمیت

ڈاکٹر البصیر احمد

گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ کے دوران اللہ کے فضل و کرم سے طبیعت قدرے بہتر ہونے پر خیال آیا کہ ”حکمتِ قرآن“ کے پچھلے سات آٹھ سال کے شماروں کی فائلوں (جو سالانہ چار چار سہ ماہی پر چوں کی مجلد شکل میں قرآن اکیڈمی کی لائبریری اور دفتری ریکارڈ کے لیے تیار کی جاتی ہیں) پر نظر ڈالوں اور جریدے کے قلمی معاونین موضوعات کی نوعیت اور انجمن خدام القرآن کے اہداف اور مقاصد کے حصول میں پیش رفت کا جائزہ لوں۔ مرورِ زمانہ کے تحت پرانے صاحبانِ علم کے رشحاتِ قلم کے ساتھ نئے اور کم عمر سالرز کی وہ تحریرات بھی قارئین کے سامنے آ رہی ہیں جن میں ان کی ژرف نگاہی، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی فہم و تحقیق کے نئے معیار قائم کر رہی ہیں، اس کا نہ صرف نوٹس لیا جائے بلکہ تحسین کے ساتھ حوصلہ افزائی بھی کی جائے۔ اس فکری کھود کرید کے دوران راقم کی نظر خود اپنے اور عزیزم عاطف وحید کے محررہ ”حرفِ اوّل“ کی اقساط پر بھی پڑی۔ انجمن خدام القرآن کے مقاصد کے ضمن میں جو افکار مؤسس انجمن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ذہن میں تھے ان کا احاطہ راقم نے جولائی/ستمبر ۲۰۲۰ء کی تحریر بعنوان ”خدا شناس تہذیب کی بازیافت کیسے؟“ میں کیا تھا جس کو صرف قند مکر نہیں بلکہ تذکیر بار دیگر کے طور پر یہاں معمولی حذف و اضافے کے ساتھ دیا جا رہا ہے:

”قارئین راقم سے اتفاق کریں گے کہ فی زمانہ زبان کھولنے اور قلم چلانے کے مواقع بہت زیادہ ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ گفتگو اور لکھنے لکھانے کے اوضاع بھی اب بدل چکے ہیں۔ قلم و قسط کی جگہ لیپ ٹاپ اور ”کی بورڈ“ نے لی ہے جس پر انگلیاں حرکت کرتی ہیں اور سکرین پر عبارت کمپوز ہو جاتی ہے۔ پھر ایک کلک سے وہ سائبر سپیس میں پہنچ کر ناظرین اور قارئین تک منتقل ہو جاتی ہے۔ بولنے اور تصویر کا معاملہ بھی کچھ عرصہ قبل تک منبر یا سٹیج سے ہوتا تھا جبکہ اب ہر نام نہاد واعظ اور عالم ایک کمرے میں سمارٹ فون کے کیمرے کے سامنے بیٹھ کر اپنی ہر طرح کی لغویات، مفوات اور سطحیات پر مبنی آراء کا اظہار کر کے سوشل میڈیا یا واٹس ایپ پر اپ لوڈ کرتا ہے اور ہزاروں دیکھنے اور سننے والوں کے اذان کو زہر آلودہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب ہر موضوع پر آن لائن نگارشات اور پوری پوری کتب PDF فارم میں اتنی وافر مقدار میں موجود ہیں کہ ذہن آخری زمانے کے فتنوں کے ذکر کی احادیث میں وارد ”نشر القلم“ اور ”فشو القلم“ کے الفاظ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، یعنی جن میں تصنیفات اور جرائد کے کثیر تعداد میں شائع ہونے کا اشارہ

ہے جو ہر طرح کے رطب و یابس سے بھرپور ہوں گے۔ اس منظر نامے (scenario) میں مقررہ داعی اور قلم کار کی legitimacy کی تعین سے قطعاً صرف نظر کر لیا جاتا ہے کہ آیا وہ صاحب/ صاحبہ پیش کیے گئے موضوع پر بولنے یا لکھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں! نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار کج فہم، بد عقیدہ اور ناپختہ اذہان صرف خطابت، چرب زبانی اور اداکاری کے زور پر لوگوں کے دین و ایمان کے ساتھ کھلوڑ کر رہے ہیں۔ گزشتہ دو اڑھائی سال کے دوران سوشل میڈیا پر مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) کے ٹولز کی آمد نے اس شیطانی عمل کو دو آتشہ کر دیا ہے اور نتیجتاً ہر تصویر مشتبہ۔

پاکستانی نژاد برٹش دانشور ضیاء الدین سردار کے بقول ہم سب عالمی سطح پر Post-Normal Era میں جی رہے ہیں جن میں مسائل اور فکری ایشوز کے ضمن میں وہ ’C‘ سے شروع ہونے والے تین الفاظ ‘complexity‘، ‘chaos‘، ‘contradictions‘ کو خاص طور پر نمایاں کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جملہ مباحث و مسائل اب از حد تدریجاً اور گھمبیر ہوتے جا رہے ہیں۔ انتشار فکری اور متضاد مقاصد بیانے اور پوزیشنز ایک دوسرے کے مقابل پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں۔ اس صورت حال میں خاصا پڑھا لکھا انسان بھی حیرت و استعجاب سے سر پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اتہامات، الزامات اور جوابی الزامات سے سوشل میڈیا پر آنے والی تحریریں اور اردو/ انگریزی دونوں اخبارات کے کالم اور ادارتی شذرات بھی ثولیدہ فکری اور سطحیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ رد و قدح سے بھرپور تحریروں کو Facebooky محققین ڈائلاگ (مکالمہ) کا نام دیتے ہیں، جبکہ حقیقتاً اس کا کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ اس موضوع پر مفصل نقطہ نظر ڈاکٹر رشید ارشد نے قلم بند کیا ہے جو قارئین زیر نظر شمارے میں پڑھ سکتے ہیں۔

اس صدی کے آغاز بالخصوص اس کی دوسری دہائی میں اسلام مخالف سیکولر مغربی فکر و کلچر نے اپنے مقامی ایجنٹوں کے تعاون سے پاکستانی معاشرے اور سماج میں نفوذ کے کچھ نئے ڈھنگ بھی اختیار کیے ہیں، جن کا شعور موثر اخبارات کے فہم قاری بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان میں اہم ترین ادب اور لٹریچر کے حوالے سے festivals کا انعقاد ہے، جو پاکستان کے پانچ چھ اہم اور بڑے شہروں میں مؤثر پبلیٹی کے ساتھ بہت اہتمام سے منعقد کیے جاتے ہیں۔ ایلٹی کلاس کی دلچسپی اور شرکت کے لیے ان میں تین چار یونیورسٹی پروفیسرز اور دانشور مصنفین غیر مماثلک سے بھی مدعو کیے جاتے ہیں۔ یہ بالعموم دو سے تین دن تک جاری رہتے ہیں اور ان میں داخلہ تمام شہریوں (مرد و خواتین) کے لیے کھلا اور بلا ٹکٹ ہوتا ہے۔ کچھ میلے اور اکٹھے مخصوص اشخاص سے منسوب کر کے منعقد کیے جاتے ہیں، جس کی ایک اہم مثال ”فیض امن میلہ“ ہے۔ کچھ علاقائی زبانوں کے حوالے سے برپا کیے جاتے ہیں جن میں مقامی زبانوں کے ادبی شہ پاروں کے تعارف و تبصروں کے ساتھ کلچرل شوز بھی لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ موضوعات کی کثرت و تنوع کی وجہ سے مقررین/ بائشین کو ایک ہی وقت میں کئی سماعت گاہوں میں بٹھایا جاتا ہے اور سامعین شرکاء اپنے ذوق کے مطابق مخصوص محافل میں بیٹھ کر گفتگو سنتے ہیں۔ بعد ازاں سوال/ جواب کے لیے بھی وقت دیا جاتا ہے۔ ان میں پیش کیے گئے خیالات اور بحث و تمحیص کا تذکرہ دو تین ہفتوں تک اخبارات میں جگہ پاتا ہے اور اس طرح ان کی خوب تشہیر ہوتی ہے۔ چونکہ ان تقاریب کی انتظامیہ کو ملکی مہتمول اداروں مثلاً بینکوں اور تجارتی

کمپنیوں NGOs اور مغربی ممالک سے فنڈنگ کی جاتی ہے اس لیے یہ ان کے ایجنڈے کے مطابق سیکولر اور لبرل خیالات کو پروموٹ کرتے ہوئے اسلام نظریہ پاکستان اور برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کو خوب رگیدتے ہیں۔ ادب اور لٹریچر festivals بعض غیر ملکی ایجنٹوں اور ملٹی نیشنل تجارتی کمپنیز کے تعاون سے اب پاکستان سے باہر مثلاً لندن، نیویارک اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی ہونے لگے ہیں تاکہ پاکستان کا soft image ان مغربی ممالک میں بھی پیش کیا جائے۔ ایک گروپ نے مختلف انداز اختیار کرتے ہوئے اس قسم کے سنگت کو Thinkfest کے نام سے بھی کراچی اور لاہور میں منعقد کیا ہے، جہاں ”افکار تازہ“ کا سلوگن اپنی جدیدیت پسندی کے اظہار کے لیے نمایاں کیا جاتا ہے۔

دین دشمن سیکولر لبرل خیالات و افکار کے شیوع کا عمل برسوں پہلے یعنی پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جلد ہی شروع ہو گیا۔ وطن عزیز کی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تحقیقاتی اداروں میں سیکولر مغربی فکر و کلچر سے متاثر استاد نہ کا عمل دخل خاص طور پر تعلیمی و تدریسی سیٹ آپ میں طلبہ و طالبات کے اذہان میں تشکیک اور مذہب مخالف نقطہ نظر پیدا کرنے میں کچھ پروفیسر خواتین و حضرات کا رول از حد افسوس ناک رہا ہے۔ دینی مسلمات اور یقینیات میں رخنہ اندازی دھیمے اور خوش گوار لہجے کے ذریعے شیریں زہر چکانی اور تشکیک آفرینی ان پروفیسروں کے مخصوص ہتھیار ہیں۔ وہ برملا اپنے مادہ پرستانہ تصور حیات اور اسلام دشمنی کا نہ صرف اظہار کرتے ہیں بلکہ مذہبی لوگوں پر طعن و تشنیع کے تیر بھی برساتے ہیں۔ تعلیمی اداروں سے باہر ذہین اور پڑھے لکھے لوگوں پر بھی یہ حضرات و خواتین اپنے مضامین (جو اکثر و بیشتر موقر انگریزی روزناموں اور ہفت روزہ جرائد میں شائع ہوتے ہیں) کے ذریعے اثر انداز ہوتے ہیں۔ فرس کے معروف پروفیسر جو حال ہی میں ایف سی کالج یونیورسٹی سے فارغ کیے گئے ہیں مذہبی ایمان و ایقان اور اسلامی فرائض و شعائر کی پابندی کرنے والے افراد کے لیے تمسخر کے انداز میں روزنامہ Dawn کے ایک کالم میں یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں:

“feverishly preparing for travel to the hereafter”

ایک صادق الایمان پابند صوم و صلوة اور اخلاق و عمل میں قرآن و سنت کے اوامر پر عمل کرنے والے شخص کے رویے کی ایک اعتبار سے یہ انتہائی بھونڈی اور تضحیک آمیز تعبیر ہے۔ اگرچہ الحقیقت ایک صاحب ایمان اور آخرت میں محاسبہ آخری پر گہرا ایقان اور حدود آشنا زندگی بسر کرنے والے شخص کے اعمال و کردار کی صحیح آئینہ دار بھی ہے جو اصل اور دائمی زندگی موت کے بعد کی زندگی کو مانتا ہے اور اپنے ہر عمل میں آخرت کے اجر اور فلاح کو سامنے رکھتا ہے۔ ایک الحاد زدہ ذہن اس perspective سے محروم ہے۔ اس کی گُل دلچسپی لمحہ موجود کے مسائل اور محدود احوال و ظروف سے ہوتی ہے۔ ایمانی قطعیات سے محروم یہ صرف ظلمات میں ٹامک ٹوئیاں مارنے ہی میں مست رہتا ہے، بقول قرآن: ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي حَوْضٍ يَلْعَبُونَ﴾ (الطور) یعنی یہ لوگ اپنی خام خیالی اور نیم عقلی توجہات اور خیالات ہی میں شاداں و فرحاں رہتے ہیں۔ اپنے مبداء اور معاد سے بالکل بے خبر وہ اس دارِ فنا کی لذات ہی کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں اور اپنے تئیں اپنی مساعی اور بھاگ دوڑ کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ از روئے قرآن شیطان ان کی تگ و تاز کو خوب مزین اور خوش نما بنا دیتا ہے۔ چنانچہ کامیابی و کامرانی کے سارے معیار ان کے نزدیک دنیاوی مال و دولت

اور آرام و آسائش سے متعلق ہیں۔

سطور بالا میں بیان کردہ مادیت پسندی، تشکیک، مغربی طحاندہ افکار اور ثقافتی اثرات کی بیخ کنی اور ترمیم کے لیے مؤسس انجمن خدام القرآن برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی زندگی کے کم و بیش ساٹھ سال صرف کیے۔ اس کے لیے ”رجوع الی القرآن“ کا آوازہ مشرق و مغرب میں دروس قرآن کے ذریعے انتہائی شدید محنت و مشقت اور جذبہ و استقلال کے ساتھ بلند کیا۔ ان کے دروس اور خطابات کی ویڈیوز اور شارٹ ویڈیو کلپس اب (ان کے دار فانی سے داری بقا کی طرف کوچ کرنے کے دس سال بعد) بھی سمارٹ موبائل کی سکرین پر بڑی تعداد میں لوگ دیکھ اور سن رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بلاشبہ وسیع النظر اور صاحب بصیرت داعی تھے جن کی نظر عالمی احوال و ظروف اور سیاسی و ثقافتی تبدیلیوں پر گہری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دروس قرآن اور تقاریر کے دوران سامعین ہمہ تن گوش اور مسحور (mesmerized) نظر آتے تھے۔ دعوت و تبلیغ کے میدان میں انہیں عصر حاضر کے اساطین میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کلام پاک سے تعلق کے ضمن میں روحانی طمانیت، ذہنی مناسبت اور باطنی نشاط سے اس قدر بہرہ وافر عطا ہوا تھا کہ بڑھاپے اور شگستگی کے باوجود انتقال سے صرف دو روز قبل انہوں نے فیصل آباد میں رفقاء تنظیم اسلامی سے نہایت رقت آمیز گفتگو کی اور وہ ان کا الوداعی خطاب ثابت ہوا۔

بانی تنظیم اسلامی و مؤسس انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنے مطالعہ قرآن کریم کی روشنی میں واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرائض نبوت کے ضمن میں تین مقامات پر تزکیہ کا ذکر تعلیم کتاب و حکمت سے پہلے کیا۔ اس سے استشہاد کرتے ہوئے انہوں نے لوگوں کی توجہ بارہا اس حقیقت کی جانب مبذول کرائی کہ تزکیہ نفس کے بغیر دین میں ترقی اور احیائے اسلام کی جدوجہد میں اس کی اصل روح برقرار نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس تحریر میں جو مرکز انجمن خدام القرآن کی تاسیس کا باعث بنی، میں وضاحت کے ساتھ اور بصراحت ذکر کیا کہ:

”عوام کی کشت قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحاب علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفت ربانی و نور ایمانی سے منور ہوں۔ سینے کبر، حسد، بغض اور ریاسے پاک ہوں۔ زندگی حرص، طمع، لالچ اور خُب دُنيا سے خالی نظر آئے۔ خلافت علی منہاج النبوة کا نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوس قدسیہ کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا، ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیات بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے ”دل روشن“، نور یقین اور ”نفس گرم“، حرارت ایمانی سے معمور ہیں۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رواہی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحب عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگی کا مقصد وحید خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو۔“ (اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام؛ ص ۱۸، ۱۹) ☆

☆ اس اہم اور seminal تحریر کا انگریزی ترجمہ راقم نے لگ بھگ پچاس سال قبل کیا تھا۔ بعد ازاں اسی ترجمہ کو ڈاکٹر احمد افضال نے امریکہ میں بہتر انداز میں دوبارہ کیا، جسے وہاں کی تنظیم IONA نے شائع کیا۔

کار نبوت میں قرآن کی صراحت کے مطابق تعلیم حکمت بھی اہم عنصر ہے جس سے مراد دین میں مجموعی طور پر گہری بصیرت و دانش اور فقاہت ہے۔ تعلیم حکمت کا ایک مظہر علم الکلام ہے جس کے ذریعے مجددین نے دین کو عقلی اور فلسفیانہ سطح پر دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا، نیز باطل افکار اور تصورات حیات کا ابطال کیا۔ موجودہ دور میں تعلیم حکمت کا سب سے زیادہ تقاضا الحاد اور مادہ پرستی کا رد اور عقائد اسلامی کا مدلل اثبات ہے۔ تعلیم حکمت کے میدان میں اقدامات کے لیے ڈاکٹر صاحب نے قرآن اکیڈمی کی بنیاد ڈالی اور اس کے مقاصد (objectives) کا اظہار بھی محولہ بالا کتابچے میں ان الفاظ میں کیا: ”خاص ذہنی استعداد رکھنے والے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے، یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا سحر اذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیث نبویؐ فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے۔“ بعد میں انجمن کے زیر انتظام قرآن کالج بھی انہی مقاصد کی ابتدائی تیاری کے لیے قائم کیا گیا۔ راقم فی الحال قرآن اکیڈمی پر توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہے جس پر احیائے اسلام اور اقامت دین کے حوالے سے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مسلسل کم و بیش تیس برس خود اس کی نگرانی کی اور بڑی توقعات وابستہ کیں۔

راقم ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد لگ بھگ گیارہ سال انجمن کا منتخب صدر رہا ہے۔ اس عشرہ میں قرآن اکیڈمی کے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I اور پارٹ II) کو نہ صرف قریب سے دیکھتا بلکہ اس کے جملہ انتظامی امور میں ناظم شعبہ تعلیم و تحقیق اسلامی (بعد ازاں ناظم اعلیٰ انجمن) عزیزم حافظ عاطف وحید کے ساتھ دلچسپی لیتا رہا ہے۔ اس دو سالہ کورس کے فضائل و برکات کے حوالے سے وہ شرکاء بالخصوص گواہ ہیں جنہوں نے تقسیم اسناد کے موقع پر قرآن و سنت اور اصول فقہ کی تدریس کو نہ صرف سراہا بلکہ اپنے چند اساتذہ میں سے خاص طور پر محمد رشید ارشد اور مومن محمود کی بے حد تحسین کی۔ یہ عمل ایک آدھ بار نہیں بلکہ گزشتہ سولہ سترہ برس سے مسلسل ہوتا آ رہا ہے۔ ☆ اسے irony of history سمجھیے یا کچھ اور رجوع الی القرآن کورس کے فاضلین میں سے تو معدودے چند لیکن ان دو مدرسین نے امتیاز کے ساتھ ان اہداف کے حصول میں نمایاں خدمات سرانجام دیں جن کے حصول کے لیے قرآن اکیڈمی قائم کی گئی تھی۔“

احیائی دینی فکر کو سطحیت اور جمود کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے گہری دینی بصیرت کے ساتھ عصر حاضر کی علمی و عقلی سطح کی ایسی تازگی اور توانائی (rejuvenation) کی ضرورت ہے جو معاصر گلوبل حالات کا گہرا فہم و ادراک بھی رکھتی ہو۔ اس سلسلے میں انجمن اور قرآن اکیڈمی کو صدر مؤسس کی خواہش کے عین مطابق اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک اعلیٰ تدریسی اور ریسرچ ادارے کے طور پر علمی ممارست و فقاہت اور فکری تدوین نو کا کام کرنا ہے۔ یہ ہدف مشکل تو ہے، لیکن اس کی ضرورت ہر گز رتے دن کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ امام غزالیؒ نور اللہ مرقدہ نے اپنی معرکہ الآراء تصنیف ”احیاء علوم الدین“ کے چار حصوں میں سے پہلے حصے میں علم اور عقیدے کی اہمیت کو بصیرت افروز، عالمانہ اور انتہائی مؤثر انداز میں شرح و بسط سے تحریر فرمایا ہے۔ اس سے مستفاد ایک عالم ربانی (اغلباً قرآنی عربی کی تدریس میں عزیزم آصف حمید کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے۔ ☆

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا یہ قول قابلِ توجہ ہے کہ جو دینی پراجیکٹ مضبوط علمی مقدمات اور گہری دینی علمیت و فقاہت پر استوار ہوگا اس میں داخلی انتشار اور فتنے کے امکان کم ہوں گے۔

جریدہ ہذا کے تمام مشمولات گزشتہ کم و بیش نصف صدی سے سطور بالا میں مذکور مقاصد کے لیے قرآن کریم، حدیث و سنت رسول ﷺ اور سلف صالحین کے علم اصول الدین اور فقہ کی تشریحات پر مبنی رہے ہیں۔ علوم القرآن میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے ابو جعفر بن ابراہیم الغرناطی کی تالیف ”ملاک التأویل“ راقم کے استاذ ڈاکٹر صہیب حسن کی تلخیص اور ترجمانی کی شکل میں بلا قسط شائع ہو رہی ہے جو قرآنیات کا علمی ذوق رکھنے والے اصحاب کے لیے خاصے کی چیز ہے۔ زیر نظر شمارے میں اس سیریز کی ۳۵ (پینتالیسویں) قسط قارئین کے مطالعے میں آرہی ہے۔ ڈاکٹر صہیب صاحب اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود ہر سہ ماہی قسط باقاعدگی کے ساتھ لندن سے ارسال کرتے ہیں جس کے لیے انجمن اور مجلس ادارت ان کی ممنون احسان ہے۔ ان کے لیے صحت و عافیت کے ساتھ درازی عمر اور آخرت میں اعلیٰ اجر کے لیے دعا گو ہے۔ اسی طرح افادات پر وفیسر حافظ احمد یارؒ میں ترجمہ قرآن مع صرغ و نحوی تشریح اور اس کی ترتیب و تدوین جو جناب لطف الرحمن خان مرحوم کی محنت شاقہ کا عظیم کارنامہ ہے اب سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۵۲ سے آگے بڑھ رہا ہے۔ لطف الرحمن خان صاحب نے محترم استاد حافظ احمد یار کی لطافت بیانی کو اپنی تحریر میں برقرار رکھا ہے اور انتہائی قیمتی نوٹس کی شکل میں علمی وضاحتیں پیش کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان دونوں کی قبریں نور سے بھر جائیں اور آخرت میں بھی بہترین صلہ سے سرفراز ہوں۔ ”حکمت قرآن“ میں دو اور پروفیسر حضرات نے علمی موضوعات پر تحریر لکھی ہیں جن میں سے سینئر محمد یونس جنجوے صاحب مضامین کے ساتھ نئی کتابوں کا تعارف اور ان پر تبصرہ بھی لکھتے رہے۔ کچھ عرصے سے کبرسنی اور بیماری کے باعث وہ گھر پر صاحب فراش ہیں۔ قارئین سے ان کی صحت کا ملکہ عاجلہ و مستمرہ کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ پروفیسر حافظ قاسم رضوان ماشاء اللہ باقاعدگی سے اکیڈمی تشریف لاتے ہیں۔ رجوع الی القرآن کورس (سال اول) کے اکیڈمی ہاسٹل میں مقیم طلبہ کے لیے بعد نماز مغرب تربیتی لٹریچر کا مطالعہ کرواتے ہیں جس سے شرکاء فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان کے رشحات قلم بھی گزشتہ سات آٹھ سال سے ”حکمت قرآن“ میں شائع ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ۲۰۲۰ء تک ”حکمت قرآن“ کی مجلس ادارت میں شامل رہے ہیں اور متعدد اہم علمی موضوعات پر ان کی تحریریں پرچے میں شائع ہوئی ہیں۔ اب کئی برس سے وہ اپنے ادارے اور یوٹیوب چینل وغیرہ سے دعوتی و تعلیمی اور عمومی دینی شعور کو اجاگر کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ حافظ زبیر صاحب ماشاء اللہ محقق عالم ہیں۔ انہوں نے عصری علمی تحدیات اور شبہات جو گمراہ حضرات کی طرف سے دین اور نصوص پر کیے جاتے ہیں کا دلائل کے ساتھ رد کیا ہے اور اس طرح یہ متعدد اہم و مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔

اکیڈمی کے فاضل ترین اساتذہ کا تعارف اور علوم نبوت کے کلاسیکل مراجع و مصادر کے گہرے مطالعہ و فہم کے ساتھ جدیدیت (modernity) اور عصری سوشل سائنسز پر گہرائی اور تنقیدی نگاہ سے ان کی گرفت کا ”حکمت



قرآن“ کے صفحات پر ذکر متعدد بار کیا جا چکا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران استاذ مؤمن محمود کے برادر اصغر مکرم محمود بھی اکیڈمی کے علمی افتخار پر روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئے ہیں جو عقیدہ و علم الکلام کے ساتھ قدیم و جدید سماجی علوم کے مباحث میں بھی خوب درک رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک اور قابل اور محنتی فاضل شخصیت ثاقب احمد کے ساتھ رجوع الی القرآن کی دونوں کلاسز (سال اول و دوم) میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں اور طلبہ بالعموم ان کی علمی قابلیت اور تدریسی طریقے کے معترف ہیں۔ عزیزم مکرم محمود نے کورین نژاد (بعد ازاں جرمن) دانشور بیان چل ہان کی کئی کتابوں کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے یہ واضح کیا ہے کہ جدید انسان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ سائبرٹیکنالوجی نے برپا کیا ہے۔ فرد کے ساتھ نظام اور ریاست کے معاملات میں بھی تحول عظیم ہوا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سعی و جہد کی گنجائش یقیناً موجود ہے، لیکن یہ کام وہی کر سکتے ہیں جو جدید نظام کی نظری تفہیم رکھنے کے ساتھ مضبوط ارادے اور ایمانی و اخلاقی وجود کے حامل بھی ہوں۔

موجودہ ریاستی ڈھانچے کی شرعی تکلیف مکرم محمود صاحب کا خاص موضوع ہے۔ کم عمری میں بھی ان کے قلم کی پختگی دیدنی ہے۔ وہ السیاسة الشرعية کے معاملات کو اجتہادی سمجھتے ہیں، لیکن شاکي ہیں کہ ایسے معاملات میں ہمارا جدید اجتہاد مغربی استعماری تصورات و نظریات کی اسلام کاری میں صرف ہوتا ہے۔ یہ دین کے مفاہیم اور نظام مراتب میں ایک غیر محسوس تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ ان کا مضمون ”نصب امامت اور جدید تصورات ریاست“ ۱۸ صفحات پر پھیلا ہوا ایک وقیع علمی بحث ہے (بابت اپریل۔ جون ۲۰۲۲ء)۔ انہوں نے دس نکات میں اپنے اسلامی سیاسی فہم کو سمیٹا ہے۔ آخری نکتے میں انہوں نے خلافت و امامت کے وجوب کو ضروریات شرعی میں سے قرار دیا کیونکہ یہ ایک واجب کا مقدمہ ہے اور وہ واجب تنفیذ احکامات تشریعیہ ہے۔ راقم کو ان کی اس فکر اور اسی سال کی پہلی سہ ماہی میں شائع ہونے والی تحریر بعنوان ”علم العقیدہ سعید عبداللطیف فودہ اور عصر حاضر“ میں پیش کیے گئے خیالات کی اس عبارت میں ٹکراؤ اور تناقض نظر آتا ہے:

”طاقت کی اپنی ایک دنیا ہے اور طاقت کے حصول کے لیے دین کے کچھ اصولوں اور قطعیات پر سمجھوتا کر لینا دین اور مسلمانوں کے علمی تہذیبی اور سیاسی غلبے کے لیے ایک متضاد طریقہ عمل ہے۔ کیا رب العزت نے ہم کو اس کا مکلف بھی ٹھہرایا ہے؟ یہ بھی جدیدیت کے پیدا کردہ اثرات میں سے ایک ہے کہ کامیابی اور ناکامی غلبے اور مغلوبیت کا معیار دنیا کو ہی قرار دیا جائے اور مسلمان قوم کے لیے اسلام کو قربان کر دیا جائے۔“

واقعہ یہ ہے کہ مغربی استعماری دور کے بعد دنیا کے بیشتر علاقے میں وجود میں آنے والی ”قومی“ ریاستیں چونکہ UN- ورلڈ کی مقررات کی پابند ہیں اس لیے ان کے اقتصادی، سیاسی، کلچرل، عدالتی، تعلیمی غرضیکہ ہر طرح کے اجتماعی نظام کی اساسات الحادی اور سیکولر فکر پر استوار ہیں۔ راقم کو محترم شیخ حامد کمال الدین کی ایک حالیہ پوسٹ کا یہ جملہ از حد پُر حکمت لگا کہ ہمارے اسلامی اعتقاد کی domain میں ماڈرن سٹیٹ (بھلے فلاحی ہو یا کچھ اور) ہمارے قرآنی آئیڈیلز اور سٹرکچر پر نہیں ڈھل سکتی۔ سردست ہمیں صرف ”جماعت المسلمین و امامہم“ پر فوکس رکھنا ہے۔

چنانچہ داخلی طور پر حدیث میں بیان کردہ ”طائفہ منصورہ“ کی افزائش و تمکین کے لیے بھرپور دعوتی و تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنی ہیں۔ اس تناظر میں عزیزم کرم محمود کی تحریریں انتہائی فکر انگیز علمی جواہر کا معدن ہیں۔ قرآن اکیڈمی کے فاضل اساتذہ میں جناب مفتی ارسلان محمود بھی تجوید قرآنی، فقہ اور مسائل فقہ کو وضاحت اور دلچسپ انداز میں طلبہ کے سامنے رکھتے ہیں اور مثالوں سے تنقیح کر کے ان کی تفہیم کو آسان بناتے ہیں۔

علم العقیدہ و الکلام دین اسلام کے اساسی علوم میں سے ہے۔ یہ صرف اللہ کا خصوصی کرم ہی ہے کہ عصر حاضر کے انتہائی سیکولر اور اخلاق باختہ عالمی ماحول میں بھی دین اور علوم دین کی حفاظت اور نشر و اشاعت میں کچھ سعید روہیں مصروف عمل ہیں۔ انہی میں سے سعید عبداللطیف فودہ ایک بڑے متکلم ہیں۔ اصول فقہ اور علم الکلام جن کو ”اصیلین“ کا عنوان بھی دیا جاتا ہے آپ کا میدان تخصص ہیں۔ آپ اشاعرہ کے مکتب فکر کے نمائندہ ہیں، اگرچہ اشاعرہ میں اہل سنت کی اشعری اور ماتریدی دونوں روایتیں آجاتی ہیں۔ شیخ فودہ کی متعدد کتابوں میں سے ایک اہم کتاب ”بحوث فی علم الکلام“ کا اردو ترجمہ ”کلامی مباحث“ عزیزم کرم محمود نے تین سال قبل کر لیا تھا، جو اسی ماہ غزالی فورم کی طرف سے شائع ہو کر قارئین کے مطالعہ کے لیے دستیاب ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب علم جدید کے طلبہ اور متشکک اذہان کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام فاضلین کی توفیقات میں اضافہ اور برکت کو صحیح معنی میں نصرت دین کا باعث بنائے۔ آمین! ❀❀❀

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ویب سائٹ

[www.khuddamulquran.org](http://www.khuddamulquran.org)

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ مرکزی انجمن خدام القرآن کے قیام کے مقاصد اور ان کے حصول کا طریقہ کار
- ☆ ادارے کے تحت جاری مختلف علمی و تعلیمی کورسز کی تفصیل
- ☆ صدر مؤسس کے مختلف آڈیو/ویڈیو خطابات
- ☆ صدر انجمن کے دروس قرآن اور ڈاکٹر محمد رشید ارشد کے دروس حدیث
- ☆ صدر انجمن اور امیر تنظیم اسلامی کے خطابات جمعہ
- ☆ صدر مؤسس کی شائع شدہ کتابوں کے ای ایڈیشن
- ☆ حکمت قرآن، یشاق اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

## مکالمے کا واہمہ

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

### جدید مکالمے کا فریب اور لبرل نظام کا تضاد

معاصر دنیا میں مقبول عام بیانیوں کے متوازی ایک خاص طرز فکر کو ایک صاحب علم نے ”ریڈرز ڈائجسٹ اسلام“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اصطلاح بنیادی طور پر ایک ایسے سطحی فکری نظام کی نشان دہی کرتی ہے جو انسان کو محض ایک عارضی داخلیت اور ظاہری طمانیت فراہم کرتا ہے۔ اس دائرے میں ”سب اچھا ہے“ کا راگ الاپے، غیر مشروط محبت اور ”سب کا بھلا“ سب کی خیر“ جیسے اصولوں پر اصرار کر کے حقیقی علمی و فکری اختلافات سے پہلو تہی کی جاتی ہے۔ موجودہ حالات میں اس فکری سادگی سے باہر نکلنا اور معاصر چیلنجز کے تئیں علمی سنجیدگی اختیار کرنا وقت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اس وقت عوامی مقبولیت پر مبنی (populist) بیانات کی مروجہ داستان کو چیلنج کرنے اور ایک متبادل زاویہ نگاہ سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ یہ موقف دیگر بیانیوں کی افادیت کا منکر نہیں بلکہ اسے موجودہ فکری تنوع کے منظر نامے میں ایک مسلمہ اور متوازن پوزیشن کے طور پر پیش کرتا ہے۔

جدید دور کو عام طور پر مکالمے (Dialogue) کا عہد قرار دیا جاتا ہے، جہاں فکری آزادی اور ہر پھول کو کھلنے دینے کے تصور پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اس فکر کے ڈانڈے کارل پوپر (Karl Popper) کے مشہور فلسفیانہ تصور ”اوپن سوسائٹی“ سے ملتے ہیں، جس کا لب لباب معاشرے کو فکری طور پر کھلا رکھنا اور ہر نظریے کو اظہار کی مکمل آزادی دینا ہے۔ مغرب کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ مکالمے کا اصل علم بردار ہے، مسلسل گفتگو پر یقین رکھتا ہے، اور اپنے بنیادی نظریات پر بھی مستقل نظر ثانی کرتا رہتا ہے۔ اسی مفروضے کی آڑ میں روایتی معاشروں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے افکار منجمد (fossilized) ہو چکے ہیں اور وہ صدیوں پرانے متون پر اصرار کر کے ایک جگہ رک (fixated) گئے ہیں، جبکہ مغربی فکر متحرک ہے۔

مغرب کے اس دعوے کو من و عن درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تصور کہ یہ دور محض غیر جانبدارانہ مکالمے کا ہے اور مکالمے سے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں، دراصل ایک مقبول عام نعرہ ہے جس کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب کا طرز امتیاز اظہار رائے کی آزادی ہے، جہاں طنز و مزاح (satire) کی کھلی چھوٹ ہے اور ہاورڈ زین (Howard Zinn) یا برنی سینڈرز (Bernie Sanders) جیسے متبادل اور باغیانہ سوچ رکھنے والے لوگ بھی مروجہ نظام سے انحراف (defiance) کے باوجود اعلیٰ فکری و سیاسی عہدوں

تک پہنچ جاتے ہیں۔ مغرب کا نظام بظاہر ان فکری لہروں کو خود میں جذب کر کے اپنی لچک پذیری کا تاثر دیتا ہے؛ تاہم اس ابلاغی نعرے کی پس پردہ حقیقت اور اس کے فکری تضادات پر تفصیلی بحث ناگزیر ہے۔ مذکورہ بالا پس منظر کو سمجھتے ہوئے اب مغربی لبرل نظام کے اصل تضادات کی طرف آتے ہیں۔

مغربی لبرل نظام (Liberal Order) کے نظریہ آزادی کا اگر باریک بینی اور گہرے فکری شعور سے جائزہ لیا جائے، تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہاں اظہارِ رائے کی ظاہری آزادی کے پس پردہ آزادیِ عمل (freedom of action) مفقود ہے۔ اس نظام کے تحت متبادل یا باغیانہ افکار کو لکھنے اور بولنے کی کھلی چھوٹ دراصل ایک منظم حکمتِ عملی کا حصہ ہے۔ لبرل ڈھانچا اس پورے عمل کو عوامی جذبات اور فکری ہیجان کا غبار نکالنے (venting) کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ نظام کی بقا اسی میں ہے کہ احتجاج اور اختلاف کو محض گفتار کی حد تک محدود رکھا جائے، لیکن جیسے ہی یہ متبادل گفتگو عملاً کسی حقیقی تبدیلی کی طرف بڑھنے لگتی ہے، نظام کے موجود دفاعی میکانزم متحرک ہو جاتے ہیں۔

معرکہ غزہ اور لبرل نظام کی ناکامی: اس فکری تضاد کی بدترین معاصر مثال معرکہ غزہ کے دوران سامنے آنے والے عالمی واقعات ہیں۔ مغربی ممالک اور ان کی مقتدر جامعات میں اس انسانی بحران کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کیے گئے، کڑی تنقید ہوئی اور متبادل بیانیے سامنے لائے گئے۔ اس کے باوجود عملاً وہ نظام اس ریاستی جبر، پالیسیوں اور فوجی امداد کو روکنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ یہ صورتِ حال واضح کرتی ہے کہ مغربی لبرل ڈیموکریسی میں شدید ترین عوامی اور فکری احتجاج بھی مقتدرہ کے عملی فیصلوں کو تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں آزادی اظہار محض ایک بے اثر کھار سس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

اہل علم اور معاصر مفکرین کے لیے یہ نکتہ گہرے تدبر کا متقاضی ہے کہ کیا لبرل ازم کے دعوے دار معاشروں میں واقعی حقیقی تبدیلی کی آزادی موجود ہے! گہرا تحلیلی تجزیہ یہی ثابت کرتا ہے کہ وہاں نام نہاد اظہارِ رائے کی آزادی کا ایک سیلاب تو برپا ہے، لیکن جب بات مروجہ سرمایہ دارانہ اور لبرل نظام کو جڑوں سے تبدیل کرنے یا اس کے عالمی اثرات کو روکنے کی آتی ہے، تو حقیقی آزادی عمل کا وجود وہاں بھی مفقود ملتا ہے۔ نظام خود کو برقرار رکھنے کے لیے متبادل آراء کو صرف اسی وقت تک برداشت کرتا ہے جب تک وہ بے ضرر رہیں؛ جیسے ہی وہ عمل کا روپ دھارنے لگتی ہیں، نظام کی ہمہ گیر گرفت ان کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

## روایتی بمقابلہ لبرل معاشرت

اس کے برعکس، روایتی مسلم معاشروں اور ان کے ریاستی ڈھانچوں کا تناظر یکسر مختلف ہے۔ معروف معاصر مفکر فرید زکریا مسلم ریاستوں کو بنیادی طور پر ”غیر لبرل ریاستیں“ قرار دیتا ہے، کیونکہ یہ ریاستیں تاحال مغربی طرز پر پوری طرح جدید نہیں ہو پائیں۔ یہ غیر لبرل ہونا دراصل ان معاشروں کی اپنی اخلاقی اقدار کی پاس داری کا ثبوت ہے، نہ کہ کوئی علمی خامی۔ ان معاشروں میں مطلق آزادی کو خیرِ اعلیٰ (Summum Bonum) کے طور پر

تسلیم نہیں کیا جاتا، بلکہ اسے ہمیشہ اخلاقی اور الہامی حدود کے تابع رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاشرے مغربی پیمانے پر لبرل ڈیموکریسی کہلانے کے حق دار نہیں ٹھہرتے۔

تاہم اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ مغربی طرز کی متبادل کنٹرولڈ ”نیشن اسٹیٹ“ کے معیار پر پورا نہ اترنے کے سبب ان روایتی سماجوں میں تاریخی طور پر ایک خاص حد تک اظہار اور عمل دونوں کی حقیقی آزادی موجود رہی ہے۔ یہاں فکری لہریں صرف غبار نکالنے تک محدود نہیں رہتیں، بلکہ سماجی اور عملی سطح پر اثر انداز ہونے کی حقیقی صلاحیت رکھتی ہیں۔

عصر حاضر میں ابلاغی منظر نامے کی تیز رفتار تبدیلی کے باعث آزادی گفتار اور آزادی کردار کے مابین ایک معکوس تعلق قائم ہوتا جا رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں سوشل میڈیا کے غیر معمولی اُبھار نے روایتی سنسرشپ کے ڈھانچوں کو بظاہر بے اثر کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں ہر موضوع پر کھل کر گفتگو کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال سطحی طور پر ایک وسیع فکری آزادی کا تاثر دیتی ہے، لیکن اس کے متوازی انسانی خود مختاری اور سماجی اثر پذیری پر پوشیدہ قدغیں مسلسل سخت ہوتی جا رہی ہیں۔ بظاہر اظہار رائے کی حوصلہ افزائی تو کی جا رہی ہے، مگر عملی سطح پر خود مختاری کی تکنیکی حدود اتنی سخت کر دی گئی ہیں کہ انسان محض ایک ڈیجیٹل آواز بن کر رہ گیا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مروجہ نظاموں میں اظہار رائے پر جتنا اصرار یا تکنیکی پابندیاں بڑھ رہی ہیں، اس کے بالکل برعکس عملاً کچھ کر گزرنے کی صلاحیت دن بدن مفلوج ہوتی جا رہی ہے۔ معاصر انسان بولنے کی حد تک تو انتہائی فعال نظر آتا ہے، مگر اس کا یہ بولنا محض لائینی الفاظ اور ڈیجیٹل کیبنس تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، جو حقیقی دنیا میں کسی تعمیری تبدیلی کا محرک بننے سے قاصر ہے۔

یہ فکری و عملی تضاد ایک گہرے عالمی بحران کی نشان دہی کرتا ہے، جس کی طرف روایتی معاشرے بھی تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں۔ دنیا اب ایک ایسے ہمہ گیر کنٹرول اور گرفت (totality) کی طرف مائل ہے جہاں مستقبل کا سماجی ڈھانچا شاید زبانی حد تک تو کچھ آزادی برقرار رکھنے کی اجازت دے، لیکن عملی سطح پر موثر اقدامات کی آزادی کو مکمل طور پر سلب کر لے گا۔ یہ ماڈل فرد کو متبادل یا نیے بنانے کی چھوٹی سی فکری عیاشی تو فراہم کرتا ہے تاکہ وہ خود کو آزاد تصور کرے، لیکن مقتدرہ کے بنیادی اور سٹرکچرل فیصلوں کو اس فکری دائرے سے بالکل الگ اور محفوظ رکھتا ہے۔

## علم، طاقت اور استعماری کنٹرول کے حربے

معاصر فکری تناظر میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ مکالمہ لازمی طور پر ذہنوں کو کشادہ کرتا ہے اور انسان کو روایتی جکڑ بند یوں یا ذہنی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ تاہم، خود جدید مغربی مفکرین نے اس خوش کن تصور کو علمی سطح پر چیلنج کیا ہے۔ مغرب میں جدید علم کا تصور محض سچائی کی تلاش یا اخلاقی و روحانی بالیدگی کا نام نہیں ہے، بلکہ وہاں علم کو بنیادی طور پر طاقت کا ایک متبادل سرچشمہ تسلیم کیا گیا ہے، جس کا حتمی اظہار ”علم بذاتِ خود طاقت ہے“

(Knowledge is Power) کے مشہور نظریے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس فکر کی ابتدائی بنیادیں فرانسس بیکن (Francis Bacon) کے ہاں ملتی ہیں، جنہوں نے علم کو فطرت پر فتح پانے اور مادی غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔ معاصر دور میں یہ فلسفہ فرانسیسی مفکر مشیل فوکو (Michel Foucault) کے افکار پر آ کر اپنے نقطہ کمال تک پہنچا۔ فوکو کے نزدیک علم اور طاقت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں؛ علم کا اصل مقصد کائنات، معاشرے اور متبادل انسانی رویوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ اس پیراڈائم کے تحت مروجہ مکالمہ کوئی غیر جانبدار نہ سرگرمی نہیں، بلکہ یہ طاقتور طبقات کی جانب سے اپنی حاکمیت کو علمی جواز فراہم کرنے کا ایک مؤثر ابلاغی حربہ ہے۔

طاقت کے مختلف سماجی و علمی مظاہر: معاصر سیاسی و سماجی علوم میں حاکمیت یا اثر پذیری کی صلاحیت کو محض عسکری یا جسمانی طاقت تک محدود نہیں سمجھا جاتا، بلکہ یہ مختلف سماجی، علمی اور نفسیاتی شعبوں سے کشید کی جاتی ہے۔ سماجی ڈھانچے میں دوسروں کے افعال کو متاثر کرنے والی مقتدر طاقت کے نمایاں مظاہر درج ذیل فکری جہات کے مرہونِ منت ہیں:

- سماجی طاقت (Social Power): یہ طاقت فرد کو سماجی ڈھانچے میں اس کے منصب، احترام اور باہمی تعلقات کے نیٹ ورک کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔
- ماہرانہ طاقت (Expertise Power): کسی مخصوص شعبے (جیسے طب یا قانون) میں اعلیٰ مہارت اور علم کے باعث فرد کو معاشرے میں ایک مقتدر سند یا اتھارٹی کا درجہ مل جاتا ہے۔
- علمی طاقت (Knowledge Power): معلومات کے اس عہد میں اُن حقائق اور ڈیٹا پر کنٹرول حاصل کرنا جن کی دوسروں کو ضرورت ہو، طاقت کا ایک بڑا محرک بن چکا ہے۔
- تفویض کردہ طاقت (Ascribed Power): یہ وہ غیر مکتسب طاقت ہے جو فرد کو اس کی موروثی شناخت، خاندانی پس منظر، سماجی طبقے یا صنف کی بنیاد پر معاشرہ خود فراہم کرتا ہے۔
- جبر پر مبنی طاقت (Forced/Coercive Power): اس سے مراد دھمکی، سزا یا خوف کے مروجہ استعمال کے ذریعے دوسروں کو اپنے احکامات کے تابع کرنے کی منفی صلاحیت ہے۔
- مقبولیت کی طاقت (Celebrity/Referent Power): یہ طاقت فرد کی ذاتی سحر انگیزی، شہرت یا کرشماتی شخصیت سے جنم لیتی ہے، جس سے وہ رائے عامہ کو متاثر کرتا ہے۔
- ابلاغی و ترغیبی طاقت (Persuasion Power): منطقی دلائل یا جذباتی اپیل کے ذریعے بڑے عوامی گروہوں کو اپنے نظریات کا ہم نوا بنانے کی خطابیہ استطاعت
- اخلاقی طاقت (Moral Power): یہ طاقت فرد کے راسخ اخلاقی اصولوں، آفاقی اقدار اور کردار کی سچائی سے جنم لیتی ہے۔ اس مقتدرہ کے حاملین معاشرے میں حد درجہ قابلِ اعتماد اور معتبر سمجھے جاتے ہیں، اور وہ اپنے مخلصانہ طرزِ عمل سے دوسروں کو انہی عقائد پر کاربند ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ روایتی معاشروں

میں مذہبی اور فکری رہنما اس اخلاقی طاقت کا سب سے بڑا مظہر ہوتے ہیں۔

● کرسماقی طاقت (Charismatic Power): اس سے مراد فرد کی سحر انگیز شخصیت، غیر معمولی جاذبیت اور گفتگو کے جادو سے دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے۔ کرسماقی رہنما اپنے گرد ایک وسیع عوامی حلقہ اور فداکارانہ وفاداری کا نیٹ ورک قائم کرنے میں کامیاب رہتے ہیں، جس کا استعمال سیاسی اور انقلابی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے۔

● اجتماعی طاقت (Group Power): یہ طاقت کسی بھی گروہ یا تنظیم کی باہمی یکجہتی اور گروہی تال میل سے پیدا ہوتی ہے۔ انفرادی کوششوں کے برعکس ایک منظم گروہ اجتماعی جدوجہد کے ذریعے مقتدرہ پرداؤ ڈالنے اور اپنے مطالبات منوانے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے، جیسا کہ ٹریڈ یونینز یا سول سوسائٹی کے نیٹ ورکس۔

● تفویض کردہ یا قانونی طاقت (Legitimate / Delegated Power): یہ وہ حاکمیت ہے جو کسی باقاعدہ تنظیمی، آئینی یا قانونی ڈھانچے کے تحت کسی فرد کو سونپی جاتی ہے۔ یہ طاقت فرد کی ذات سے نہیں بلکہ اس کے رسمی عہدے یا منصب سے وابستہ ہوتی ہے، جس کے تحت وہ اپنے ماتحتوں کو احکامات دینے کا مجاز ٹھہرتا ہے۔

اب یہ بنیادی فکری سوال پیدا ہوتا ہے کہ: مقتدر قوتیں انسانوں پر یہ ہمہ گیر گرفت اور کنٹرول کیسے قائم کرتی ہیں؟ جدیدیت کا اصول یہ ہے کہ جب تک آپ کو حکومتوں کے بارے میں مکمل، جامع اور باریک معلومات حاصل نہ ہوں، آپ انہیں مغلوب نہیں کر سکتے۔ نوآبادیاتی نظام اس سائنسی سچائی کا سب سے بڑا گواہ ہے۔

استعمار کے موضوع پر مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب انگریزوں نے برصغیر کو اپنی نوآبادی بنایا، تو کنٹرول قائم کرنے کے بہت سے جدید تھیں راہوں نے پہلی مرتبہ یہیں آزمائے۔ مثال کے طور پر مردم شماری (census) کے عمل کو دیکھ لیجیے۔ بظاہر یہ ایک سادہ، ریاضیاتی اور تعمیری انتظامی کام نظر آتا ہے کہ حکومت گھروں اور افراد کا شمار کر رہی ہے، لیکن درحقیقت یہ نوآبادیاتی کنٹرول قائم کرنے کا ایک انتہائی گہرا سائنسی ذریعہ تھا۔ نوآبادیاتی طاقتوں کو یہاں کے باشندوں کی نسل، ذات، پات، مذہب، معاشی حیثیت اور جغرافیہ کا قطعی علم اسی مردم شماری اور نقشہ نویسی (Cartography) کے ذریعے حاصل ہوا، جس کی بنیاد پر انہوں نے ”تقسیم کرو اور حکومت کرو“ (Divide and Rule) کی پالیسیاں مرتب کیں۔ استعماری عزائم کو نصاب اور انگریزی نظام تعلیم کے پردے میں چھپانے کی اس مربوط تزویراتی کوشش پر خاتون مصنفہ غوری وشوانا تھن نے اپنی شاہکار تصنیف Masks of Conquest میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ تمام علمی اور انتظامی ذرائع بنیادی طور پر حکومتوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے فولادی حربے تھے۔

ہابرماس کا نظریہ ابلاغی عمل: جدید فکری منظر نامے میں انسانی وجود اور معتبریت کے معیارات یکسر بدل چکے ہیں۔ جرمن مفکر یورگن ہابرماس (Jürgen Habermas) کا شہرہ آفاق ”نظریہ ابلاغی عمل“ (Theory of Communicative Action) اسی ساختی تبدیلی کا فکری احاطہ کرتا ہے۔ ہابرماس کا بنیادی استدلال یہ ہے



کہ عہدِ جدید میں فرد کا وجود اور اس کی فکری حیثیت صرف اسی حد تک معتبر تسلیم کی جاتی ہے جس حد تک وہ ابلاغ کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔

یہ تصور سترہویں صدی کے فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ (René Descartes) کے مشہور مابعد الطبیعیاتی نظریے ”میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں“ (I think, therefore I am) کی معکوس اور دقیق شکل ہے۔ ہابرماس کے پیراڈائم میں یہ اصول گویا اس طرح تبدیل ہو چکا ہے کہ ”میں ابلاغ کرتا ہوں، اس لیے میں ہوں“ (I communicate, therefore I am)۔ اس لبرل منطق کے تحت جو خیال مصلحت، خوف یا ضبطِ نفس کے باعث زبان پر نہیں آتا، مروجہ نظام کے نزدیک اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ معاصر دنیا میں صرف اسی بیانیے کو مادی حقیقت مانا جاتا ہے جو برہنہ عوامی دائرے (naked public sphere) میں ڈیجیٹل اسکرینز کے ذریعے مکمل طور پر بے نقاب ہو کر سامنے آجائے۔

سرمایہ دارانہ کنٹرول اور ابلاغی نیٹ ورک: ہابرماس کے تجارتی و ابلاغی تجزیے کے مطابق، اس برہنہ عوامی دائرے میں چلنے والے پورے فکری دھارے (discourse) کو منظم اور کنٹرول کرنے کی کلید بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام اور مقتدر کارپوریٹ طاقتوں کے پاس ہے۔ لبرل ازم بظاہر ہر خیال کو سامنے آنے کی آزادی دیتا ہے لیکن پس پردہ متبادل افکار کی ترویج اور ان کی رسائی کا فیصلہ خالص مادی اور سرمایہ دارانہ مفادات کے تحت الگوتھمز کرتے ہیں۔ یہ ابلاغی کنٹرول نوآبادیاتی غلبے کی تاریخ کا تسلسل ہے، جس کا مقصد انسانی شعور کو مغلوب کرنا ہے۔

کنٹرول اور مغلوب کرنے کی اس استعماری نفسیات کا اگر تاریخی ارتقا دیکھا جائے، تو ماضی میں استعمار کا اولین ہدف مادی اثاثے، یعنی زمینیں اور مال مولیٰ ہوا کرتے تھے۔ جب برطانوی استعمار نے برصغیر کو اپنی نوآبادی بنایا، تو زمینوں پر قابو پانے اور روایتی معیشت کو تباہ کرنے کے لیے انہوں نے یورپ کی طرز پر ”باڑھ بندی کی تحریک“ (Enclosure Movement) متعارف کروائی۔ اس پالیسی کے تحت صدیوں سے مشترکہ استعمال میں آنے والی اراضی کو سرکاری تحویل میں لے کر من پسند مقامی وفاداروں کو بڑی بڑی جاگیروں کی شکل میں بخش دیا گیا۔

انگریز استعماری آمد سے قبل، مسلم سلاطین کے دورِ حکومت میں برصغیر کا تمدنی ڈھانچا منصب داری کے ایک مربوط اور منظم نظام پر استوار تھا۔ اس روایتی نظام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ منصب دار یا اقطاع دار زمینوں کے مستقل، موروثی یا ذاتی مالک نہیں ہوتے تھے بلکہ ریاست کی طرف سے تفویض کردہ اراضی کے عوض ان پر مخصوص انتظامی، تمدنی اور عسکری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ ان کی وفات یا معزولی کے بعد وہ اراضی دوبارہ سلطنت کو منتقل ہو جاتی تھی، جس کے باعث زمین پر کسی ایک خاندان کا مستقل غاصبانہ تسلط قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

برطانوی استعمار نے اس غیر موروثی روایتی ڈھانچے کو یکسر بدل کر زمینوں کی مستقل ملکیت قانونی طور پر افراد کے نام لکھ دی۔ اس نوآبادیاتی مداخلت کے نتیجے میں برصغیر میں ایک بدترین جاہلانہ اور ظالمانہ جاگیرداری نظام نے جنم لیا۔ عام طور پر معاصر تاریخ میں یہ مغالطہ پایا جاتا ہے کہ یہ جاگیرداری عہدِ وسطیٰ کی مسلم حکومتوں کی



پیداوار ہے، حالانکہ عہدِ وسطیٰ میں اس کی صرف ایک غیر موروثی اور عارضی انتظامی شکل موجود تھی۔ برصغیر میں جس حقیقی اور جابرانہ جاگیرداری نے جڑیں پکڑیں، وہ انگریز بہادر کی تزویراتی ضرورت کی مہیون منت تھی۔ اس میں موروثیت کو داخل کر کے نسل در نسل چلا دیا گیا تاکہ استعمار کے وفادار طبقات کا ایک مستقل تسلسل برقرار رہے۔

## ڈیجیٹل دور اور نگرانی کا نیا نظام (Panopticon)

اس فکری پس منظر کے تناظر میں جب معاصر لبرل دنیا میں ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ”سب کچھ کہہ دو“ اپنے لب آزاد کر دو، تو اس کے پیچھے دراصل آزادی کا کوئی جذبہ نہیں بلکہ مقتدرہ کی ایک گہری استعماری حکمتِ عملی کارفرما ہوتی ہے۔ خاص طور پر دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی مقتدر قوتوں کو یہ ادراک ہو چکا ہے کہ اب لوگوں کو جکڑنے اور ان پر گرفت برقرار رکھنے کا سب سے مؤثر طریقہ ان کی زبان بندی یا جسمانی تشدد کرنا نہیں ہے۔

جدید کنٹرول میکانزم اب فرد کو بولنے پر اکساتا ہے (Incitement to Discourse)۔ جب انسان اپنے خیالات، جذبات، متبادل نظریات یہاں تک کہ اپنی نجی زندگی کو بھی سوشل میڈیا اور ابلاغی پلیٹ فارمز پر سرعام پیش کر دیتا ہے، تو مقتدرہ کے لیے اس کے باطن، نفسیات، کمزوریوں اور رجحانات سے واقفیت حاصل کرنا حد درجہ آسان ہو جاتا ہے۔ یہ نام نہاد ابلاغی آزادی دراصل انسانوں کے ڈیٹا اور شعور پر کنٹرول حاصل کرنے کا ایک نیا ڈیجیٹل نوآبادیاتی جال ہے، جہاں انسان خود اپنے لب آزاد کر کے اپنی فکری خود مختاری مقتدرہ کے حوالے کر دیتا ہے۔

نظامِ جبر کے دو ماڈلز: بیسویں صدی سے قبل، مغربی فکر میں یہ نظریہ انتہائی راسخ تھا کہ انسانی تاریخ ایک ناگزیر ارتقا (Inevitable Progress) اور مثالی معاشرے (Utopian Society) کی تشکیل کی طرف گامزن ہے۔ تاہم، بیسویں صدی کے عالمی حوادث، بالخصوص عظیم جنگوں اور ہولناک سیاسی بحرانوں نے اس تاریخی خوش فہمی کو شدید زک پہنچائی۔ اس فکری زوال کے نتیجے میں مستقبل کے خوف ناک سماج اور غاصبانہ مقتدرہ کی پیش گوئی کرنے والے دو شہرہ آفاق فکری ناول منظرِ عام پر آئے۔ یہ تصانیف جارج اورول (George Orwell) اور ایلڈس ہکسلے (Aldous Huxley) نے تخلیق کیں، جنہوں نے نظامِ جبر (Dystopias) کے دو مختلف اور متوازی ماڈلز کے ذریعے معاصر دنیا کے فکری منظر نامے کی عکاسی کی۔

ان دونوں مفکرین کے ہاں مستقبل کے کنٹرولڈ معاشرے کے جو دو متبادل نمونے سامنے آتے ہیں، ان میں پہلا جارج اورول کا ناول ”1984“ اور دوسرا ایلڈس ہکسلے کا شاہکار Brave New World ہے۔

اورول کا ماڈل ایک ایسے روایتی، مطلق العنان نظامِ جبر کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں انسانوں پر ہر وقت سخت پہرہ، سنسرشپ اور قید لادی جاتی ہے۔ یہ مروجہ ماڈل بنیادی طور پر اس دور کے سوویت اور روسی فاشٹ نظام کا عکس تھا۔ اس کے برعکس، ہکسلے کا ماڈل مستقبل کے لبرل نظامِ فکری خاکہ بن کر سامنے آیا، جہاں فرد کو کسی ظاہری جبر کے بجائے لامتناہی مادی آزادی اور تفریح کی وادی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

ان دونوں ماڈلز کے مابین پائے جانے والے فکری تفاوت کو معاصر امریکی نقاد نیل پوسٹ مین (Neil Postman) نے حد درجہ جامع انداز میں واضح کیا ہے۔ نیل پوسٹ مین کے مطابق، اورول کے ماڈل کا بنیادی خوف یہ تھا کہ مقتدر قوتیں طاقت کے بل بوتے پر انسانوں پر کتاب پڑھنے کی پابندی لگا دیں گی اور معلومات کو چھپا لیں گی۔ چونکہ یہ ایک کھلا اور مادی جبر ہے اس لیے انسانی جبلت اس کے خلاف عموماً مزاحمت کرتی ہے۔ اس کے برعکس، ”بر یونیورلڈ“ کا لبرل ماڈل اس سے کہیں زیادہ ہولناک اور پوشیدہ ہے۔ اس نظام میں انسان کو لذت، تفریح، اور مادی ترغیبات (seduction) میں اس حد تک غرق کر دیا جاتا ہے کہ معلومات کے سیلاب کے باوجود کوئی شخص خود سے کتاب پڑھنے اور متبادل فکری ریاضت کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ یہاں جبر باہر سے مسلط نہیں ہوتا، بلکہ فرد لا شعوری طور پر خود اپنی فکری قید کا انتخاب کرتا ہے۔

موجودہ معروضی حالات کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے، تو معاصر مسلم معاشرہ بالخصوص اس کی نوجوان نسل اسی دوسرے لبرل ماڈل کے حد درجہ قریب پہنچ چکی ہے۔ روایتی معاشروں میں جہاں کبھی علم کی جستجو اور فکری بیداری کو مرکزیت حاصل تھی، وہاں اب مابعد الطبیعیاتی اور فکری ارتقا کے لیے مادی کتب کا مطالعہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ نسل نو کو سوشل میڈیا کی Reels اور Shorts کے لا حاصل چکروں، لایٹنی سکرونگ اور عارضی کیمیکل طمانیت (Dopamine hit) کے نیٹ ورک میں الجھا دیا گیا ہے۔ یہ صورت حال دورِ حاضر کا سب سے خطرناک، نفیس اور پوشیدہ نوآبادیاتی کنٹرولڈ میکا نزم ہے، جہاں استعمار کو ذہنوں کو مفلوج کرنے کے لیے کسی سنسر شپ یا عسکری جبر کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ تفریح کا یہ ابلاغی سیلاب انسانوں کو فکری طور پر خود بخود بانجھ بنا دیتا ہے۔

جدید عالمی نظام کا یہ اصرار کہ فرد اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرے، دراصل اس کے ہمہ گیر ساختی کنٹرول کا بنیادی حصہ ہے۔ امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب ؑ کی طرف ایک گہر فکری قول منسوب ہے کہ: ((تَكَلَّمُوا تُعْرِفُوا، فَإِنَّ الْمَرْءَ مَخْبُوءٌ تَحْتَ لِسَانِهِ)) یعنی ”بولو تاکہ پہچانے جاؤ“ کیونکہ انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔“ عصرِ حاضر کے تناظر میں مقتدر قوتیں یہی آفاقی نفسیاتی اصول روایتی معاشروں کو جکڑنے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ لبرل مقتدرہ یہ چاہتی ہے کہ فرد اپنے باطن کا سارا غبار اُگل دے، تاکہ اس ابلاغی کثرت کے ذریعے اس کی فکری اور ذہنی ساخت کا دقیق سراغ لگایا جاسکے اور اسے مروجہ نظام کے تابع رکھنا آسان ہو۔ جب تک انسان خاموش رہتا ہے، اس کا فکری نظام پوشیدہ رہتا ہے؛ جیسے ہی وہ اظہار کے مروجہ ابلاغی سانچے میں ڈھلتا ہے، نظام کے لیے اس کی فکری حدود کا تعین کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

رڈار پر آنے کا تزویراتی جملہ: یہ ایک نہایت ہی نازک فکری نکتہ ہے، جس کا تجربہ معاصر علمی اور نظریاتی فورمز کو بخوبی ہوتا ہے۔ جب محدود علمی دائروں میں گہرے موضوعات اور متبادل کتب کا مطالعہ کرایا جاتا ہے، تو معاصر نظریاتی رجحان سازوں (Influencers) کی جانب سے یہ معنی خیز انتخاب سامنے آتا ہے کہ ”آپ ابھی تک (مقتدرہ کے) رڈار پر نہیں ہیں۔“ اس تزویراتی جملے کا متبادر مفہوم یہ ہے کہ جب تک کوئی فکری حلقہ بڑے پیمانے پر پبلک سکریمز، وائرل ویڈیوز اور لائمنائی سبسکرائبز کے ابلاغی دھارے کا حصہ نہیں بنتا، تب تک مقتدر نظام اس

کے گہرے اور پس چلن تیار ہونے والے متبادل بیانے سے بے خبر رہتا ہے۔ جدید لبرل نظام میں کسی بھی فکر کی اہمیت یا خطرے کا معیار اس کی علمی گہرائی نہیں؛ بلکہ اس کی عوامی مقبولیت اور ڈیجیٹل رسائی ہے جو اسے رڈار کی زد میں لے آتی ہے۔

معاصر لبرل نظام جبر کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایسے متبادل علمی حلقوں کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس کے ابلاغی نیٹ ورک سے باہر قائم ہوں۔ جب چند افراد کہیں بند کمرے میں بیٹھ کر غور و فکر کرتے ہیں؛ جس کی کوئی ڈیجیٹل ریکارڈنگ نہ کی جا رہی ہو اور جو پبلک سکرین پر براہ راست نشر نہ ہو؛ تو مروجہ عالمی نظام ایسے ہر پوشیدہ فکری فورم سے ایک گہرا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ نظام کا خود کار نگران ڈھانچا یہ چاہتا ہے کہ فرد جو کچھ بھی سوچ رہا ہے، اسے یکسرے کے سامنے آکر فوری طور پر اُگل دے۔ اس عمل کا مقصد یہ ہے کہ ڈیٹا مائننگ اور الگورتھمز کے ذریعے نگرانی کا خود کار نظام مکمل کیا جاسکے؛ تاکہ کوئی بھی فکری لہر مقتدرہ کی پیشگی اجازت اور معلومات کے بغیر معاشرے میں سرایت نہ کر سکے۔ چنانچہ معاصر دور میں سچی علمی جراحت اور فکر جدید کا درست محاکمہ اکثر انہی غیر معروف اور گہرے حلقوں میں ہی ممکن ہے جو نظام کے ڈیجیٹل سیلاب سے خود کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔

نوآبادیاتی تاریخ کا گہرا تحلیلی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ استعمار کی غاصبانہ نفسیات وقت کے ساتھ مادی اثاثوں سے منتقل ہو کر انسانی شعور کو نشانہ بنا رہی ہے۔ ماضی میں جہاں استعمار کا بنیادی ہدف زمینوں اور جغرافیائی حدود پر عملی تصرف قائم کرنا تھا؛ وہاں عہد جدید میں اس کا اگلا اور خطرناک ترین ہدف انسانی دماغ؛ اس کے ارادے اور اس کی داخلی خواہشات کو اپنے قابو میں کرنا ہے۔ اس پوشیدہ ذہنی کنٹرول کا سب سے مؤثر حربہ یہ ہے کہ فرد کو ہر وقت بولنے، اپنا مافی الضمیر اُگلنے اور اپنی لامتناہی مادی خواہشات کا سر عام اظہار کرنے پر اکسایا جائے۔ یہ ابلاغی اباحت مروجہ نظام کے لیے ایک تزویراتی حفاظتی والو (safety valve) کا کام کرتی ہے جو کسی بھی متبادل انقلابی لہر کی عملی شدت کو الفاظ کی دنیا میں ضائع کر دیتی ہے۔

معاصر دنیا میں عام طور پر یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ جدید میڈیا بڑی گراں قدر جمہوری خدمات سرانجام دے رہا ہے اور پس ماندہ طبقات یا مظلوموں کی آواز بن رہا ہے۔ تاہم اگر اس کا متبادل اور عمیق پہلو دیکھا جائے تو پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا بنیادی طور پر اس عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے سب سے بڑے اور وفادار خادم کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ میڈیا مقتدرہ قوتوں کو ہر وقت یہ تزویراتی ڈیٹا اور اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے کہ عوام کے مابین کیا مباحث چل رہے ہیں اور وہ نفسیاتی طور پر کیا سوچ رہے ہیں! جیسے ہی مقتدرہ کو یہ براہ راست معلومات حاصل ہوتی ہیں، نظام فلاحی یا ابلاغی پالیسیوں میں معمولی سا تغیر اور مطابقت کر لیتا ہے۔ اس پیشگی تدارک کا مقصد معاشرے میں کسی ایسے فکری دباؤ یا ”پریش کرکراش“ کو پیدا ہونے سے روکنا ہے جو آگے چل کر مروجہ نظام کے خلاف کسی بڑے تمدنی انقلاب کا نقطہ آغاز (Tipping point) بن سکے۔

چنانچہ اُس پر فریب لبرل مکالمے اور اظہار رائے کے پردے میں ایک انتہائی بھیانک، جابرانہ اور تاریک پہلو چھپا ہوا ہے جو بنیادی طور پر جدید نوآبادیاتی نگرانی کا ایک خود کار نظام ہے۔ اس مصنوعی ابلاغی آزادی کے

ذریعے مقتدر قوتیں روایتی معاشروں کے افراد کو فکری طور پر جان بھی لیتی ہیں اور اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ یہاں امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب ؑ کے اسی سنہری اصول ((تَكَلَّمُوا تَعْرِفُوا)) (بولو تا کہ تم پہچانے جاؤ) کا جدید معاصر رُخ واضح ہوتا ہے؛ یعنی نظام فرد کو پکارتا ہے کہ تم بولو، تا کہ تمہاری نظریاتی ساخت ہمیں معلوم ہو سکے۔ مقتدرہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ: کیا آپ کے باطن میں نظام کے مروجہ عقائد کے خلاف کوئی فکری گڑبڑ تو نہیں چل رہی؟ آپ ایک مطیع، غیر فعال اور فرماں بردار شہری بن کر زندگی گزارنے پر آمادہ ہیں؟

معاصر دور میں پوڈ کاسٹ، ویڈیوز اور ڈیجیٹل مواد کی تیاری کا یہ پورا سلسلہ بھی جو بظاہر متبادل ابلاغ کا ذریعہ نظر آتا ہے، بالآخر فرد کی فکری ساخت کو اسی عالمی نظام کے سامنے آشکار کر رہا ہے۔ لبرل مقتدرہ اس ابلاغی کثرت پر حد درجہ شادماں ہے؛ کیونکہ انسان اس سیلاب میں لاشعوری طور پر خود کو خود ہی بے نقاب (expose) کر رہا ہے۔ اس خود کار ڈیجیٹل اعتراف کے نتیجے میں متبادل افکار رکھنے والے حلقے بھی بتدریج مقتدرہ کے رڈار پر آچکے ہیں، جہاں ان کی فکری نگرانی اور کنٹرول کا دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔

عقل محض کا خواب اور عالمی جنگیں: عصر حاضر کے لبرل فکری دھارے میں یہ دلیل حد درجہ مروجہ اور مقبول عام ہے کہ معاصر دنیا میں روایتی عسکری تصادم اور جنگ و جدال کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس استدلال کے مطابق جدید ہتھیاروں کی غیر معمولی تباہ کاری اور اس سے جڑے جیو پولیٹیکل مسائل کے باعث اب بڑی طاقتوں کے مابین براہ راست جنگ ناممکن ہو چکی ہے۔ چنانچہ متبادل مسلم بیانیوں میں بھی یہ سوچ کثرت سے سرايت کر رہی ہے کہ مغربی فکری و تمدنی غلبہ کو مذہبی اور سیاسی محاذوں پر چیلنج کرنے کا واحد مؤثر راستہ اب صرف افہام و تفہیم اور مکالمہ ہی باقی رہ گیا ہے۔ اس خام فکری کالپ لباب یہ ہے کہ روایتی جنگی طریقوں کے بجائے مغرب کو اسی کے میدان میں ابلاغی و فکری مناظرے کے ذریعے مات دی جانی چاہیے۔

### تحریک تنویر (Enlightenment) کا تاریخی ناکامی کا سفر

مغربی فکری نظام کی جڑوں کا اگر باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دورِ حاضر کو محض مکالمے اور افہام و تفہیم کا عہد قرار دینا تاریخی طور پر بھی یکسر باطل ثابت ہو چکا ہے۔ یہ دراصل اٹھارھویں صدی کی یورپی تحریک تنویر کا ایک خام مابعد الطبیعیاتی تصور تھا کہ جب انسانی معاشرہ کلیسا، روایتی مذہبی پیشواؤں اور الہامی مقتدرہ کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد ہو جائے گا تو دنیا سے جنگ و جدال، قتل و غارت گری، غربت اور بیماریاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اس فکر کے حامیوں کا دعویٰ تھا کہ روایتی عقائد کے انہدام کے بعد انسانیت عقل محض کی بنیاد پر ایک ناگزیر ارتقا (Inevitable progress) اور مثالی امن کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گی۔

بیسویں صدی کے ہولناک عالمی حوادث نے ان تمام لبرل اور خوش کن بیانیوں کو شدید زک پہنچائی۔ جب عقل محض اور سائنس کے مرکز یعنی یورپ سے مہیب ترین جنگیں پھوٹیں، تو دنیا کے دانشور ایک گہرے فکری صدمے (trauma) سے دوچار ہو گئے۔ یہی وہ تمدنی موڑ تھا جہاں سے خود مغرب کے اندر اس کے اپنے زوال کے

بیانے منظر عام پر آنا شروع ہوئے۔ ان فکری تحریروں میں جرمن مفکر اوسوالڈ اسپینگلر (Oswald Spengler) کا شہرہ آفاق مقالہ The Decline of the West سرفہرست ہے، جس نے لبرل معاشرے کے حتمی انحطاط اور بحران کی فکری پیش گوئی کی۔

مغرب کے اس دعوے کو کہ جدیدیت امن اور مکالمے کا نظام ہے، محض نظریاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ تجرباتی بنیادوں پر بھی باطل ثابت کیا جاسکتا ہے۔ معروضی حقائق گواہ ہیں کہ اکیلی بیسویں صدی اور معاصر اکیسویں صدی کے ابتدائی پچیس برسوں کی تاریخ میں عالمی جنگوں اور استعماری مہمات کے سبب جتنے انسان لقمۂ اجل بنے ہیں، ان کی تعداد مجموعی انسانی تاریخ کے مقتولین سے کہیں زیادہ ہے۔

● پہلی جنگ عظیم: عقل اور سائنسی ارتقا کے دعویداروں کے مابین ہونے والا پہلا بڑا صنعتی تصادم، جس نے کروڑوں انسانوں کو مٹی میں ملا دیا۔

● دوسری جنگ عظیم: مردِ جہ لبرل اور فاشٹ نظاموں کی وحشیانہ مادی جنگ، جس کا انجام ایسی ہولناک تباہی پر ہوا جس کا باعث جوہری ہتھیار تھے۔

● ہٹلر کا ہولوکاسٹ (Holocaust): نسلی بالادستی کے مادہ پرستانہ مائنڈ سیٹ کے تحت لاکھوں انسانوں کا منظم قتل عام

● امریکی سامراج کی ریشہ دوانیاں: معاصر دور میں مشرق وسطیٰ افغانستان اور اب معرکہ غزہ تک لبرل آرڈر کی بقا کے لیے لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جانا۔

یہ تمام خونیں اور معروضی حقائق اس بات کی قطعی فکری دلیل ہیں کہ مغربی لبرل آرڈر اصلاً کسی پُر امن مکالمے یا جمہوریت پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس کا پورا ساختی ڈھانچا بدترین مادی جبر، نوآبادیاتی تسلط اور طاقت کے وحشیانہ استعمال پر استوار ہے۔ موجودہ نظام میں مکالمے کا رگ صرف اس وقت تک الاپا جاتا ہے جب تک محکوم معاشرے مقتدرہ کی فکری بالادستی کو تسلیم کیے رکھیں۔ چنانچہ اس مادی جبر کا مقابلہ محض ابلاغی خوش فہمیوں سے نہیں بلکہ ایک متبادل گہرے اور آزاد دہندہ وجود کی تشکیل ہی سے ممکن ہے۔

### مکالمے کا عدم توازن (Asymmetry of Dialogue)

مغربی نظام اقتدار کے خلاف صرف علمی افہام و تفہیم پر اصرار کرنا ایک گہرے تزویراتی مغالطے پر مبنی ہے۔ یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ مغرب نے کبھی بھی کسی کمزور یا روایتی معاشرے کو متبادل مکالمے کے طور پر اپنے برابر کا فکری حریف تسلیم نہیں کیا۔ معاصر تاریخ کے شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ مغرب کے لیے مکالمہ صرف اسی وقت تک ایک پسندیدہ قدر ہے جب تک اس کے اپنے بنیادی نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ مفادات محفوظ رہیں۔ جیسے ہی متبادل تہذیبوں کی طرف سے اس کے عالمی نظام جبر کو حقیقی چیلنج درپیش ہوتا ہے، وہ اپنی تمام لبرل روایات، اوپن سوسائٹی کے فلسفے اور آزادی اظہار کے دعوؤں کو پس پشت ڈال کر بدترین عسکری و مادی طاقت کا استعمال

کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔

اس متبادل پہلو پر گہرا تدبیر نگزیر ہے کہ کیا محض ابلاغی مواصلات کے ذریعے ایک ایسے عالمی نظام کو پس ماندہ کیا جاسکتا ہے جس کی جڑیں مادی طاقت، مالیاتی اداروں اور عسکری غلبے پر استوار ہوں! تاریخ عالم کا یہ ایک پختہ سائنسی اصول ہے کہ فکری بحیث اور علمی مکالمے صرف انہی دائروں میں نتیجہ خیز ہوتے ہیں جہاں دونوں فریق اخلاقی ضوابط کی پاس داری کریں اور مادی ترازو برابر ہو۔

مغرب علم کو سچائی کے بجائے صرف ”طاقت اور کنٹرول کا حربہ“ سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ لبرل مکالمے کے پلیٹ فارمز کو مسلم معاشروں کے فکری دانش مندوں کو جکڑنے، ان کی نفسیات کا سراغ لگانے اور ان کی انقلابی توانائی کو لایعنی بخشوں میں ضائع کرنے کے لیے بطور حفاظتی والو استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ یہ گمان کرنا کہ صرف الفاظ کے تبادلے سے مغربی پیراڈائم کو بدلا جاسکتا ہے، حد درجہ سادہ لوحی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کو اگر عصرِ حاضر کے اس ہمہ گیر نوآبادیاتی بحران سے نکلنا ہے، تو اسے اس فریب مکالمہ سے باہر آنا ہوگا۔ مغرب کا مقابلہ محض زبانی کلامی مباحثوں یا پوڈ کاسٹ کے معاصر ابلاغی سانچوں سے نہیں کیا جاسکتا، جہاں انسان خود کو خود ہی مقتدرہ کے رڈار پر لے آئے۔

حقیقی متبادل جدوجہد کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم معاشرے فکری طور پر اپنی الہامی و مابعد الطبیعیاتی روایت میں پختگی اختیار کریں۔ عملی سطح پر مادی، تعلیمی، معاشی اور تمدنی قوت کے ایسے آزاد دائرے (autonomous zones) تخلیق کریں جو مروجہ عالمی نظام کے محتاج نہ ہوں۔ جب تک روایتی معاشرے داخلی طور پر مادی اور اخلاقی قوت کے توازن کو قائم نہیں کرتے، تب تک مغرب کے ساتھ کوئی بھی مکالمہ محض ایک محکوم کی فریاد بن کر رہ جائے گا، جو نظامِ جبر کو پگھلانے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتا۔

مغربی تمدنی غلبے کے سامنے افہام و تفہیم اور نظریاتی تبادلے کے تصورات بظاہر حد درجہ پُرکشش اور موضوعی حد تک نہایت دلکش معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی معروضی اور مادی حقیقت یکسر مختلف ہے۔ اس پورے ابلاغی منظر نامے میں اصل فکری الجھن یہ ہے کہ جن دو فریقوں کے مابین مکالمے کی وکالت کی جاتی ہے وہ مادی طاقت، تکنیکی بالادستی اور بین الاقوامی حیثیت کے لحاظ سے شدید غیر متوازن (asymmetrical) ہیں۔ ان کے درمیان پایا جانے والا تفاوت اس تقابل سے واضح ہوتا ہے جہاں ایک طرف کوئی بالغ کھڑا ہوا اور دوسری طرف کوئی معصوم بچہ۔ ایک مقتدر بالغ اپنے سے کمزور بچے کو ہر وقت مروجہ بھاشن، نصیحت اور احکامات تو جاری کر سکتا ہے، لیکن وہ مادی توازن کے مفقود ہونے کے باعث کبھی بھی پلٹ کر اس کمزور فریق کی فہمائش یا متبادل بیانیے کو سننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی نے اپنے دورِ مسعود میں اسی نوآبادیاتی مائنڈ سیٹ اور نفسیاتی مغلوبیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ۔

میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا

بیٹو کی کیا سند ہے، صاحب کہے تو مانو!

ان کی سب سنتے ہیں، اپنی نہیں کہہ سکتے کچھ  
کیا قیامت ہے زباں کٹ گئی اور کان رہے!

روایتی معاشرے کا فرد جب تک اپنی علمی روایت سے کٹا رہتا ہے، وہ صرف استعماری آقا (صاحب) کی سند ہی کو حرفِ آخر تسلیم کرتا ہے، اور اپنوں کی مخلصانہ نصیحتوں کو native (مقامی یا دیسی) کہہ کر مسترد کر دیتا ہے۔ معاصر لبرل نظام میں یہی مغلوبیت اس نچ پر پہنچ چکی ہے جہاں روایتی معاشروں کی حیثیت صرف سننے والے یعنی لینے والے (receiving end) تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ ایک ایسا فکری بحران ہے جہاں محکوم سماج کی اپنی زبانیں عملاً کاٹ دی گئی ہیں؛ وہ اپنی بات کہنے کی استطاعت سے محروم ہیں اور ان کے کان مروجہ عالمی نظام کے ایک طرفہ سبق سننے کے لیے چوبیس گھنٹے کھلے ہیں۔ استعمار اب صرف مادی وسائل پر قابض نہیں ہے، بلکہ وہ مسلم معاشروں کو یہ درس بھی دے رہا ہے کہ انہیں اپنے عقائد، روایات اور اسلامی افکار کی تعبیر کس طرح کرنی چاہیے۔ مقتدر قوتیں یہ چاہتی ہیں کہ الہامی متون کی آفاقیت کو ان کے لبرل سانچے میں ڈھالنے کے لیے اس کی مروجہ ”مرمت“ اور Touch-up کر دی جائے، تاکہ دین کا کوئی ایسا رخ باقی نہ رہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے مادی مفادات سے ٹکراتا ہو۔

چنانچہ یہ گمان کرنا کہ موجودہ عصر حقیقی اور مساویانہ مکالمے کا دور ہے، محض ایک ابلاغی مغالطہ ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے مغرب کسی تعمیری تبادُل کے بجائے صرف ایک طرفہ خطاب (monologue) پر اصرار کر رہا ہے؛ وہ اپنی مادی اور لبرل شریعت تو دنیا پر نافذ کرنا چاہتا ہے مگر کسی متبادل فکر کو برابری کی سطح پر سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہے۔

اس تزویراتی تضاد کی سب سے بڑی تاریخی مثال اس وقت سامنے آئی جب امریکی مفکر سیموئیل ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civilizations) کا جارحانہ نوآبادیاتی نظریہ پیش کیا۔ اس مروجہ نظریے کے جواب میں جب روایتی دنیا کی طرف سے ”تہذیبوں کے مابین مکالمے“ (Dialogue among Civilizations) کا متبادل اور پُر امن تصور سامنے رکھا گیا، تو عالمی مقتدرہ نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس متبادل تجدیدِ ابلاغ کی ناکامی کی بنیادی وجہ وہی تھی کہ دونوں دائروں کے مابین مادی اور عسکری قوت کا توازن سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔

جدید عالمی نظام کی جغرافیائی و سیاسی ساخت بنیادی طور پر مادی قوت کے مرکز (metropole) یعنی مغرب اور اس کے زیر اثر رہنے والے حاشیے (periphery) یعنی مسلم و روایتی دنیا کے مابین بٹی ہوئی ہے۔ نوآبادیاتی مرکز اور اس کے حاشیے کے مابین قائم ہونے والا تعلق کبھی بھی دو طرفہ نہیں ہو سکتا، بلکہ مقتدرہ کی مجبوریوں کے تحت یہ ہمیشہ ایک طرفہ ہی رہتا ہے۔

مرکز ہمیشہ احکامات، نظریات اور مادی ضوابط جاری کرتا ہے، جبکہ حاشیہ صرف ان کی تعمیل اور تقلید کرنے پر



مجبور ہوتا ہے۔ لہذا جب تک مسلم دنیا مادی، تمدنی اور علمی سطح پر خود کو حاشیے سے نکال کر اپنی مستقل اور آزاد مقتدرہ قائم نہیں کرتی، تب تک مروجہ لیبرل پلیٹ فارمز پر مغرب کے ساتھ کسی بھی مکالمے کی امید رکھنا ایک ایسا فکری سراب ہے جو مغلوبیت کے اس طویل تسلسل کو کبھی ختم نہیں کر سکتا۔

## داخلی فکری بحران: الحاد اور تقدس کا خاتمہ

سماجی و ثقافتی ممنوعات (taboos) کے مروجہ زوال کے بعض ابلاغی پہلو بظاہر روشن نظر آتے ہیں۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مکالمے اور اظہارِ رائے کی کھلی فضا سے نظریات کی اصلاح (rectification) کا عمل شروع ہوتا ہے اور باطل تصورات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ تاہم، اس بظاہر مثبت ارتقا کے پیچھے جدیدیت اور مغربی تحریک تنویر کا وہ خطرناک ترین فلسفہ کار فرما ہے جسے علمی دنیا میں تقدس کا خاتمہ (Death of Sacredness) کہا جاتا ہے۔ اس لادین فکر کا بنیادی اصرار یہ ہے کہ کائنات میں اب کسی بھی ہستی، اصول یا مابعد الطبیعیاتی حقیقت کو تقدس کا مقام حاصل نہیں ہے۔

اس فکری زوال کی واضح اور بدترین مثال خود معاصر مغربی تہذیب ہے۔ وہ اجتماعیت جو کبھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر عیسائی تہذیب کے نام سے قائم تھی، جب دورِ تنویر اور سیکولر ازم کے مختلف مراحل سے گزری تو اس کا منطقی نتیجہ شعائرِ دین کی تذلیل کی صورت میں نکلا۔ اس عمل نے معاشرے سے حیا اور ادب کے ان پہروں کو بھی ہٹا دیا ہے جو کسی بھی تہذیب کو بکھرنے سے بچاتے ہیں۔ معاصر مغربی دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے توہین آمیز خاکے بنانا اور ان کی ذاتِ گرامی کا استہزاء اڑانا آزادیِ اظہار کے نام پر ایک معمول بن چکا ہے اور وہ اس فکری ابتداء پر کسی قسم کی اخلاقی ندامت بھی محسوس نہیں کرتے۔

ہر ہستی اور نظریے کو تنقید کی زد میں لانے کے اس لاشعرا اصرار نے بالآخر ایک ایسی لادین اور خالص دنیا دار تہذیب (profane civilization) کو جنم دیا ہے جہاں اخلاقی و روحانی اقدار کا وجود مٹ چکا ہے۔ یہ لہر انسانی معاشرے کی ہر اعلیٰ قدر کو ابتداء اور عامیہ پن کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ جب انسانی شعور سے تقدس کا یہ مابعد الطبیعیاتی تصور یکسر خارج ہو جائے تو فرد داخلی طور پر کھوکھلا ہو کر معدومیت (Nihilism) کے بے معنویت اور شدید قنوطیت کی وادی میں گر جاتا ہے، جہاں زندگی کا کوئی حتمی مقصد باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ تہذیب جو آزادی کا نعرہ لگا کر آئی تھی، خود اپنی ہی آزادی کے بوجھ تلے دب کر ایک ایسی مادی جیل بن چکی ہے جس میں سکون کا نام و نشان نہیں۔

پاکستان میں الحادی رجحانات کی ترتیب: اگر معاصر پاکستانی معاشرے میں الحاد کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا گہرائی سے مشاہدہ کیا جائے، تو وہاں بھی یہی مخصوص اور منظم طریقہ کار کام کرتا نظر آتا ہے۔ یہاں الحادی فکر پھیلانے والے فکری دھارے کسی اچانک ردِ عمل کے طور پر سامنے نہیں آتے، بلکہ ان کی لہریں ایک خاص سٹرکچرل ترتیب سے آگے بڑھتی ہیں۔ یہ فکری فتنہ سب سے پہلے معاشرے کے سیاسی اور عسکری مقتدرہ کی قانونی و انتظامی



حیثیت کو نشانہ بناتا ہے، تاکہ ریاست کا ظاہری اور تنظیمی رعب کمزور پڑ جائے۔ اس کے بعد اگلا وار مذہبی طبقے، مروجہ مدارس اور علماء کی مسلمہ علمی حیثیت پر کیا جاتا ہے، تاکہ دین کی تشریحی روایت سے عوام کا اعتمادی رشتہ ٹوٹ جائے۔ انکاری فکر کا یہ تسلسل روایتی معاشرے کو نظریاتی طور پر غیر مستحکم کرنے کا ایک آزمودہ حربہ ہے۔ جب ریاستی اور مذہبی مقتدرہ کے احترام کو دل سے کھرچ دیا جاتا ہے، تو اس فکری خلا کو پُر کرنے کے لیے الحادی قوتیں اگلا قدم اٹھاتی ہیں۔ یہ سفر مسلمات زندگی اور سماجی حدود پر یکے بعد دیگرے تنقید کرتے کرتے بالآخر آخرت، جنت، جہنم اور معاذ اللہ ذات باری تعالیٰ ہی کے قطعی انکار تک جا پہنچتا ہے۔ چنانچہ معاصر الحاد محض ایک ذہنی لہر نہیں، بلکہ یہ روایتی معاشروں کے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی ڈھانچے کو منہدم کرنے کی ایک باقاعدہ فکری مہم ہے، جس کا مقابلہ روایتی سطحیت سے ہٹ کر گہری علمی متانت کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

مسلم معاشروں میں الحادِ عملی اور بے تو قیری (profanity) کے معاصر رجحانات کا اگر تاریخی مطالعہ کیا جائے، تو اس کی جڑیں نجی ذرائع ابلاغ کے ارتقا سے جڑی دکھائی دیتی ہیں۔ پچھلی صدی کے اواخر تک روایتی سماج میں اس بات کا تصور تک مفقود تھا کہ علماء دین، صوفیاء یا شعائر اسلام کا علانیہ استہزاء کیا جاسکتا ہے۔ تاہم، سابق صدر پرویز مشرف کے دور حکومت میں جب نجی الیکٹرانک میڈیا کو فروغ ملا، تو آزادی اظہار کے نام پر ایک نیا ابلاغی کلچر متعارف کروایا گیا۔ اس نئے میڈیا آرڈر کے تحت طنز و مزاح اور تحقیر آمیز تمثیلوں (memes/dummies) کے ذریعے مروجہ مقتدر شخصیات اور اخلاقی مابعد الطبیعیاتی اقدار کے وقار کو پامال کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس ثقافتی انحطاط کا ایک مضحکہ خیز اور تضاد سے بھرپور پہلو یہ تھا کہ تمثیل نگاری اور تذلیل کے اس عمل میں اخلاقی حدود تو پامال ہوئیں، لیکن مادی طاقت کے حامل گروہوں کے سامنے یہ لبرل آزادی اظہار ہمیشہ سرنگوں رہی۔ مثال کے طور پر اس دور میں کراچی کے ایک مخصوص مقتدر سیاسی رہنما اور ان کی جماعت کی تمثیل بنانے کی جرأت کسی ابلاغی ادارے کو نہیں تھی، کیونکہ ان کے پاس عسکری اور مادی طاقت موجود تھی۔ اس کے برعکس، جن اہل اللہ اور علماء کے پاس صرف اخلاقی و علمی وقار تھا، انہیں اس مادر پدر آزاد ابلاغی لہر کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ صورت حال ثابت کرتی ہے کہ مروجہ لبرل آزادی اظہار دراصل مادی قوت کے سامنے کمزور اور اخلاقی بنیادوں پر حد درجہ سنگین المیے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اخلاقی حدود بمقابلہ اباحت: دورِ حاضر کے جدت پسند اور لبرل طبقے کا یہ ایک مستقل استدلال بن چکا ہے کہ روایتی معاشرے ”تہذیبی گھٹن“ کا شکار ہیں۔ ان کے مطابق، سماج میں بڑھتے ہوئے جنسی جرائم اور اخلاقی پستیاں دراصل روایتی اور الہامی جکڑ بندیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس فکر کے حاملین کارل پوپر کے ”اوپن سوسائٹی“ کے فلسفے کو بطور حل پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر معاشرے کو اخلاقی طور پر بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے، تو ممنوعہ امور کی صدماتی یا ہیجانانی حیثیت (shock value) ختم ہو جائے گی اور انسانی نفسیات خود بخود دان لغزشوں سے باز آ جائے گی۔

یہ استدلال سراسر خام فکری اور مابعد الطبیعیاتی حقائق سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ تاریخ اور معاصر دنیا کے شواہد یہ بتاتے ہیں کہ اخلاقی حدود کا خاتمہ جرائم کی کمی کا باعث نہیں بنتا، بلکہ یہ انسانی جبلتوں کو مزید بے لگام کر کے خاندانی اور سماجی ڈھانچے کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ مکالمے اور ابلاغ کی اس مطلق آزادی کو کئی طور پر کوئی مثبت مظہر تسلیم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کے بطن میں ایک گہرا منفی اور تخریبی پہلو چھپا ہوا ہے۔ جب سماج سے حیا، تقدس اور حدود کا تصور مٹ جائے، تو وہ معاشرہ نظریاتی طور پر ناجھ ہو جاتا ہے۔ اس نازک فکری بحران کے پیش نظر اہل علم بالخصوص اہل دین پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جب وہ عصر حاضر کے پیچیدہ موضوعات کو مکالمے کے دائرے میں لائیں، تو ان کا لب و لہجہ اور طریقہ کار حد درجہ محتاط، سنجیدہ اور علمی وقار کے تابع ہونا چاہیے تاکہ مروجہ لادینیت کا مقابلہ جذباتیت کے بجائے ٹھوس فکری بنیادوں پر کیا جاسکے۔

مسلم علمی روایت میں ایک نہایت جامع اصطلاح ”مقدسات“ استعمال کی جاتی ہے جس کا بنیادی مقصد فرقہ وارانہ اور سماجی ہم آہنگی کے لیے متبرک شخصیات، شعائر اور نظریات کا احترام یقینی بنانا ہے۔ اس کے برعکس، معاصر مغربی فکری نظام میں سرے سے ”مقدسات“ نام کی کسی شے کا کوئی فلسفیانہ تصور ہی موجود نہیں ہے۔ اگر وہی مغربی لبرل ماڈل مسلم معاشروں میں بھی کثرت سے رائج ہو گیا، تو اس کا لازمی نتیجہ ہر مقتدر، محترم یا متبرک ہستی کی تقدیس کے خاتمے کی صورت میں نکلے گا۔

تاہم اس چیلنج کا ایک مثبت علمی پہلو بھی ممکن ہے۔ اگر علمی حدود کی پاس داری، متانت اور دینی احتیاط کے ساتھ معاصر افکار کا جائزہ لیا جائے، تو اس ”فکری جراثیم“ کے گہرے علمی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ متبادل تنقیدی عمل بہت سے الحاد زدہ اور مرعوب ذہنوں کا مثبت فکری تزکیہ (catharsis) کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

تاریخی تناظر میں اگر ان معاشروں کا مطالعہ کیا جائے جہاں عیسائیت کا غلبہ رہا، تو وہاں ایک خاص حد تک الہامی تعلیمات کے سبب خیر کا ایک پہلو اور سماجی حدود موجود رہیں۔ جب دو رتنوں میں ان روایتی حدود کو چیلنج کیا گیا، تو وہ معاشرے اخلاقی و روحانی زوال کا شکار ہو گئے۔

دوسری طرف ایسے معاشرے بھی ہیں جو مشرکانہ یا بت پرستانہ (paganistic) بنیادوں پر استوار ہیں جیسے ہندو ازم اور ہندوستان کا سماجی ڈھانچا۔ ان معاشروں میں موجود غیر عقلی ممنوعات، نسلی انوچ نیچ اور ذات پات کے روایتی بتوں کو توڑنے کی ضرورت یقیناً زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ البتہ اس مشرکانہ پس منظر میں بھی آزادی کا مطلب مطلق اباحت نہیں ہو سکتا، بلکہ وہاں بھی سماجی بقا کے لیے کچھ نہ کچھ حدود و قیود رکھنے پڑیں گے۔ یہ تصور سراسر لایعنی ہے کہ مغرب یا کسی متبادل مشرکانہ نظام میں کوئی حد ہی نہیں ہے؛ دراصل دنیا کے ہر نظام میں کچھ ایسی ریڈ لائنز اور حدود موجود ہوتی ہیں جن پر عام حلقوں میں گفتگو کی اجازت نہیں دی جاتی۔ پس ثابت ہوا کہ آزادی کا نام لے کر تقدس کو پامال کرنا حقیقی آزادی نہیں، بلکہ نظام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ایک سوچی سمجھی تخریبی مہم ہے۔

نوآبادیاتی آقا اور فتنہ ارتداد: جدید نوآبادیاتی مغلوبیت صرف سیاسی یا معاشی دائروں تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس کا سب سے تاریک پہلو اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب مقتدر قوتیں محکوم معاشروں کے مابعد الطبیعیاتی اور مذہبی ڈھانچے کے اندر اثر اندازی کی کوشش کرتی ہیں۔ اس پورے قضیے میں طاقت کا شدید عدم توازن بنیادی رکاوٹ بن کر سامنے آتا ہے۔ جب برطانوی استعمار کے سائے میں برصغیر کے اندر ایک مقامی جھوٹے مدعی نبوت نے جنم لیا، تو اس فتنہ ارتداد کا خروج محض ایک انفرادی مذہبی دعویٰ نہیں تھا بلکہ وہ استعماری مقتدرہ کے سیاسی و عسکری مفادات کو تحفظ دینے کا ایک منظم تزویراتی منصوبہ تھا۔ اس گروہ نے ابتدا میں عیسائیوں اور آریہ سماج کے ساتھ بڑے مناظرے کر کے مقامی معاشرے میں اپنی علمی ساکھ بنانے کی کوشش کی، تاکہ بعد میں کیے جانے والے فکری وار کو آسانی سے راسخ کیا جاسکے۔

نظریہ جہاد کی تحریف: اس نوآبادیاتی وفاداری کا سب سے بڑا اور بنیادی ہدف اسلام کا نظریہ جہاد تھا جو استعماری غلبے کے خلاف مسلمانوں کی سب سے بڑی مادی اور اخلاقی قوت تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے نوآبادیاتی آقا کے تزویراتی مفادات کی بقا کے لیے جہاد کی ممانعت کا ایک مخصوص بیانیہ ایجاد کیا۔ اس کی کتابوں میں درج اشعار اس غلامانہ مائنڈ سیٹ کا واضح اور منہ بولتا ثبوت ہیں، جہاں وہ علانیہ یہ اصرار کرتا ہے کہ۔

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال  
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال  
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد  
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد  
تم میں سے جس کو دین و دیانت سے ہے پیار  
اب اُس کا فرض ہے کہ وہ دل کر کے اُستوار  
لوگوں کو یہ بتائے کہ وقتِ مسیح ہے  
اب جنگ اور جہاد حرام اور قبیح ہے!

وقتِ مسیح کا تقاضا جنگ اور قتال کو حرام اور قبیح قرار دینا ہے اور جو شخص اب عسکری جہاد کا اعتقاد رکھتا ہے، وہ معاذ اللہ خدا کا دشمن اور نبی کا منکر ہے۔ اس مذہبی تحریف کا واحد مقصد یہ تھا کہ مسلم مقتدرہ کو برطانوی استعمار کے سامنے فکری اور عملی طور پر بالکل نہتہ کر دیا جائے، تاکہ وہ برطانوی راج کی اطاعت کو اپنا اصل دینی فریضہ سمجھ بیٹھیں۔

تاسف کا مقام یہ ہے کہ یہی غلامانہ اور نوآبادیاتی بیانیہ عصرِ حاضر کے بہت سے ”اسلامی جدت پسندوں“ کے ہاں بھی ایک نئے اور نفیس رنگ میں پایا جاتا ہے۔ ان معاصر مفکرین کا اصرار بھی بعینہ قادیانی مائنڈ سیٹ کی

طرح یہی ہے کہ موجودہ دور محض فکری مکالمے کا دور ہے اور مسلح جہاد یا مادی مزاحمت کا تصور جدید عالمی قوانین کے تحت سرے سے مٹ چکا ہے۔ یہ لبرل طبقہ عالمی مقتدرہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے خود کو ایک مطیع اور ”فرماں بردار شہری“ (اچھا بچہ) ثابت کرنے کے لیے یہ راگ الاپتا ہے کہ ان کے افکار سے مروجہ عالمی امن کو کبھی کوئی فکری گز بڑ درپیش نہیں ہو سکتی۔ اگر کہیں متون کے دباؤ کے تحت قتال کا تذکرہ آ بھی جائے، تو یہ جدت پسند اسے محض چند روایتی اور دفاعی حدود تک محدود کر دیتے ہیں، تاکہ مغرب کا مادی تسلط کسی بھی سطح پر چیلنج نہ ہو سکے۔

مغربی لبرل آرڈر کی اس پُر فریب امن پسندی اور ابلاغی طمع کو اگر تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو اس کے بھیانک تضادات کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ جب بیسویں صدی میں اطالوی فاشٹ رہنما موسولینی نے حبشہ (ایتھوپیا/ اریٹیریا) اور بعد میں لیبیا پر وحشیانہ عسکری حملے کیے اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا، تو اس دور کے مروجہ عالمی ادارے جمعیت اقوام (League of Nations) میں دیگر یورپی لبرل طاقتوں نے اس ہولناک جارحیت پر محض زبانی جمع خرچ اور سطحی تنقید تو کی، مگر عملاً اس استعماری جبر کو روکنے کے لیے کوئی مادی اقدام نہیں کیا۔ تاریخ ایسے نوآبادیاتی تضادات اور وحشیانہ جبر سے بھری پڑی ہے، جہاں کمزور معاشروں کو بین الاقوامی قوانین اور امن کے راگ سنوا کر نہتہا کیا جاتا ہے، جبکہ مقتدر قوتیں خود مادی طاقت کے وحشیانہ استعمال کو اپنا حق اولیں سمجھتی ہیں۔ قادیانی بیانیے کا اصولی مقصد بھی مسلمانوں کو اسی جابرانہ مادی قوت کے سامنے ہمیشہ کے لیے مفلوج کرنا تھا۔ جہاں تک معاصر دنیا میں جہاد کی درست حکمت عملی اور اس کے شرعی و تزویریاتی خدوخال کا تعلق ہے، تو وہ ایک وسیع اور الگ تفصیلی موضوع ہے جس پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔

### جہاد اور مزاحمت: علامہ اقبال کا نقطہ نظر

مقام لا اور اثبات: حکیم الامت علامہ اقبال نے معاصر دنیا کے اسی فکری انتشار کی گہری تشخیص کی تھی۔ جب ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر اشتراکی انقلاب برپا ہوا، تو علامہ اقبال نے اشتراکیوں کو کوئی روایتی اخلاقی نصیحت کرنے کے بجائے ان کے فکری سفر کا گہرا تحلیل جائزہ لیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ اشتراکی مفکرین مروجہ ظالمانہ نظاموں اور جھوٹے خداؤں کے انکار، یعنی مقام ”لا“ تک تو پہنچ چکے ہیں، لیکن ان کی اصل فکری ضرورت یہ ہے کہ وہ اس سے آگے بڑھ کر اثبات، یعنی مقام ”الا اللہ“ کی طرف آئیں۔

علامہ اقبال نے اپنے افکار میں اس فکری سفر کی تصویر کشی کرتے ہوئے واضح کیا کہ جدید تحریکوں نے ”لاسلطین، لا کلیسا، لا اللہ“ کا نعرہ بلند کیا۔ انسانی تاریخ میں مقتدرہ کی بنیادی طور پر دو ہی بڑی شکلیں رہی ہیں: سیاسی و ملوکیتی طبقہ (سلاطین) اور مذہبی پیشوائیت (کلیسا یا روایتی علماء)۔ معاصر مادہ پرستانہ جدیدیت ان دونوں مروجہ نظاموں کا انکار کرتے کرتے اپنے منطقی انجام یعنی مطلق انکارِ خدا (لا اللہ) تک جا پہنچتی ہے، جو انسانی فکر کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

روایتی معاشروں کو فکری طور پر نہتہا کرنے کے لیے نوآبادیاتی اور لبرل مقتدرہ نے ہمیشہ ایک خاص ابلاغی

تقسیم کا سہارا لیا ہے، جہاں قلم (علم و مکالمہ) کو جدیدیت کی علامت اور تلوار (مادی مزاحمت) کو عہدِ قدیم کا ایک متروک ہتھیار ثابت کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ مروجہ فکری دھارے میں یہ فتویٰ حد درجہ مقبول ہے کہ عصرِ حاضر خالصتاً قلم کا زمانہ ہے، اور اب معاصر دنیا میں مادی قوت یا عسکری مزاحمت کی کوئی کارگر حیثیت باقی نہیں رہی۔

قلم اور تلوار کا تلازمہ: یہ بیانیہ بنیادی طور پر روایتی معاشروں میں ایک مصنوعی اطاعت اور ذہنی مرعوبیت پیدا کرنے کا حربہ ہے۔ اس نوآبادیاتی مرعوبیت اور نام نہاد امن پسندی کے پردے کو چاک کرنے کے لیے حکیم الامت علامہ اقبال نے اپنی معرکہ آرا نظم ”جہاد“ میں اس فکری مغالطے کا گہرا تزویراتی نقد پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے لافانی اشعار کے ذریعے مروجہ مذہبی پیشوائیت اور لبرل جدت پسندوں کے اس سطحی استدلال کو کُٹلی طور پر مسترد کر دیا ہے:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے  
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کا رگر  
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟  
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود و بے اثر  
تیغ و تفنگ دستِ مسلمان میں ہے کہاں  
ہو بھی، تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

ان اشعار کا گہرا تحلیلی مفہوم یہ واضح کرتا ہے کہ قلم کی اہمیت اور اس کی ابلاغی طاقت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن جب معاصر مقتدرہ کے اپنے ہاتھ میں تیغ و تفنگ (جدید ترین عسکری و مادی طاقت) موجود ہو اور وہ اس کے بل بوتے پر روایتی معاشروں کے جغرافیہ، معیشت اور روح کو کچل رہی ہو، تو اس وحشیانہ جبر کے سامنے صرف قلم کی دہائی دینا اور مکالمے کا راگ الاپنا بدترین قسم کی خود فریبی ہے۔ چنانچہ اصل مسئلہ قلم یا تلوار کی مروجہ ترجیح کا نہیں ہے، بلکہ اس ”انسانی ایجنسی“ اور ”دل“ کا ہے جو موت کی لذت (شہادت کے جذبے اور اخلاقی جرات) سے محروم ہو کر مادی نظامِ جبر کا لاشعوری غلام بن چکا ہے۔ جب دل داخلی طور پر کھوکھلا ہو جائے اور اس میں مابعد الطبیعیاتی حقائق پر غیر متزلزل یقین باقی نہ رہے، تو وہ مقتدرہ کی مادی طاقت سے مرعوب ہو کر ”امن پسندی“ کے لبرل ملمع کو اوڑھ لیتا ہے۔

موقوفِ اقبال یہ ثابت کرتا ہے کہ تمدنی بقا اور نوآبادیاتی غلبے کا حقیقی مقابلہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ ذہنی طور پر لبرل ابلاغ کے ڈیجیٹل رڈار سے باہر نکلے۔ مادی و اخلاقی قوت کے مابین ایک ایسا حقیقی توازن قائم کرے جہاں قلم کی روشنی کو تلوار کا مادی تحفظ حاصل ہو، تاکہ کوئی بھی استعماری نظام انسانیت کو اپنے خود کار نگرانی کے جال میں مقید نہ کر سکے۔

مغربی لبرل نظام کی جانب سے مسلم معاشروں پر مستقل طور پر عسکریت پسندی کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے،

وہ معروفی اور تاریخی حقائق کے سراسر خلاف ہے۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ مسلم دنیا گزشتہ ڈیڑھ صدی سے زائد عرصے کے دوران خود مغربی نوآبادیاتی جبر، جغرافیائی تقسیم اور تزیوراتی یلغار کا شکار رہی ہے اور ہر عالمی بحران میں صرف نقصان اٹھانے والی نظر آتی ہے۔

جہاں تک ان عناصر کا تعلق ہے جنہیں معاصر سیاسی زبان میں غیر ریاستی عناصر (Non-state actors) کہا جاتا ہے، تو ان کی مروجہ سرگرمیاں محض فروغی اچھل کود تک محدود ہیں۔ ان میں سے متعدد گروہ تو متبادل فکری انحراف کے باعث دین کے نام پر زمین میں سراسر فساد انتشار اور خوں ریزی مچانے کے ذمہ دار ہیں، جن کا اسلام کی اصل علمی و جہادی روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس فکری تناظر میں یہ بنیادی سوال قائم ہوتا ہے کہ: مسلم دنیا میں مروجہ مقتدرہ، بااثر سیاسی حلقے اور باقاعدہ ریاستی ادارے معرکہ حق اور غاصبانہ قوتوں کے خلاف متبادل مزاحمت میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟ معرکہ غزہ کی معاصر صورت حال اس ساختی اور نفسیاتی زوال کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ مسلم اُمہ نے مجموعی طور پر اس بدترین انسانی اور تمدنی بحران کے سامنے کوئی ایسی بڑی، منظم یا فیصلہ کن تزیوراتی مزاحمت قائم نہیں کی جو غاصبانہ جبر کو روک سکے۔

جن مسلم ممالک کے پاس اصل مادی طاقت، مالیاتی وسائل اور جدید عسکری ہتھیار موجود ہیں، ان کی مقتدرہ شدید نفسیاتی مرعوبیت اور داخلی کمزوری کا شکار ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے مادی غلبے سے خوف زدہ اس ذہنی کیفیت کی فکری تشخیص کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ۔

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل  
کہتا ہے کون اُسے کہ مسلمان کی موت مر  
تعلیم اُس کو چاہیے ترکِ جہاد کی  
دُنیا کو جس کے پنچے خُونیں سے ہو خطر  
باطل کی فال و فر کی حفاظت کے واسطے  
یورپ زہ میں ڈوب گیا دوش تا کر  
ہم پُوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے  
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر  
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات  
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر!

جس کا دل موت کے خوف سے لرزتا ہو، وہ کبھی مابعد الطبیعیاتی سچائی کی خاطر جینے اور مرنے کا حوصلہ نہیں پاسکتا۔ ترکِ جہاد اور امن پسندی کی لبرل تعلیمات دراصل ان قوتوں کو دی جانی چاہئیں جن کے خوں خوار مادی

بچوں سے پوری دنیا کا امن خطرے میں ہے نہ کہ ان روایتی معاشروں کو جو خود استعماریت کا ایندھن بن رہے ہیں۔ مغرب کی پُر فریب امن پسندی کا ملمع اس معروضی حقیقت سے بالکل چاک ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنے باطل رعب اور مادی سلطنت کی حفاظت کے لیے دوش تا کمر جدید ترین زہر بارود اور جوہری ہتھیاروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ جب مشرق کے مظلوم معاشرے اپنے دفاع کے لیے مادی مزاحمت کا آغاز کرتے ہیں تو مغرب کا ابلاغی نظام اسے ”شر“ اور ”عسکریت پسندی“ سے تعبیر کرتا ہے؛ لیکن جب خود مغربی سامراج اپنے عالمی مفادات کے لیے کروڑوں انسانوں کو ہلاک کرتا ہے تو اسے لبرل ڈیموکریسی کی ترویج قرار دیا جاتا ہے۔ یہ موجود نظام کا وہ بدترین اور منافقانہ تضاد ہے جہاں ساری اخلاقی پابندیاں صرف محکموں کے لیے ایجاد کی جاتی ہیں جبکہ مقتدر استعمار ہر قانون سے بالاتر رہتا ہے۔

اس پورے فکری منظر نامے کا سب سے دردناک پہلو وہ بیانیہ ہے جسے معاصر اسلامی جدت پسند بڑی کثرت سے پھیلا رہے ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ لازوال مصرع ”اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر“ اس معاصر فکری انحراف کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس لبرل ڈسکورس کا واحد تزیویراتی مقصد یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے اندر کی تمام روایات، مابعد الطبیعیاتی مسلمات اور جہادی افکار پر کڑی تنقید کی جائے اور ہر قسم کا اخلاقی و سیاسی ملبہ اپنے ہی سانچ پر ڈال دیا جائے۔

اس کے متوازی یہ طبقہ خوں خوار یورپی استعمار اور امریکی سامراج کی عالمگیر ریشہ دوانیوں کو بالکل پاک صاف قرار دے کر بری الذمہ کر دیتا ہے۔ یہ فکری مرعوبیت دراصل استعماری کنٹرول کا وہ آخری ہتھیار ہے جہاں محکوم خود اپنے دفاعی اصولوں کو جرم سمجھنے لگتا ہے اور غاصب کے جبر کو ایک ناگزیر تہذیبی ارتقا تسلیم کر لیتا ہے۔ چنانچہ معاصر افکار کا تحلیلی مطالعہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس نوآبادیاتی مائنڈ سیٹ کا پردہ چاک کر کے متبادل اور آزاد مسلم فکر کی بنیادیں دوبارہ استوار نہ کی جائیں۔

## علمی اختلاف کے اصول اور نوجوان نسل

مواصلات اور مکالمے کے دائروں میں فکری اختلاف کا ظہور ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں ایک مشہور روایت پیش کی جاتی ہے کہ ((اِخْتِلَافُ اُمَّتِي رَحْمَةٌ)) یعنی ”میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے“ (اگرچہ محدثین کے نزدیک اس حدیث کی سند میں ضعف پایا جاتا ہے)۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس تنوع اور اختلاف کا فائدہ صرف نام نہاد venting out یا جذبات کا غبار نکالنے تک ہی محدود ہے؟

علمی نقطہ نظر سے اختلاف رائے کی افادیت محض ایک نفسیاتی کتھارسس تک محدود نہیں ہے۔ اس کا حقیقی اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ معاشرے میں جمود کا شکار ہو جانے والے من گھڑت یا سخت نظریات (dogmas) کو علمی سطح پر چیلنج کرنے کا راستہ کھولتا ہے۔ جب ایک صالح اور علمی روایت کے اندر رہتے ہوئے تعمیری بیانات کے بجائے متبادل آراء سامنے آتی ہیں تو اس سے فکری ارتقا ہوتا ہے، علم کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور معاشرہ فکری بانجھ پن



سے محفوظ رہتا ہے بشرطیکہ یہ اختلاف رائے مادر پدر آزادی کے بجائے مسلمہ علمی اصولوں کے تابع ہو۔

فکری مباحث کو درست رخ دینے کے لیے یہ بنیادی نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اصولی طور پر اتحاد سراسر رحمت ہے جبکہ انتشار اور تفرقہ سماجی و علمی زحمت کا باعث بنتا ہے۔ مسلم اُمت کے اہل علم نے اس تناظر میں ایک نہایت باریک اور گہری علمی تفریق قائم کی ہے جو ”اختلاف“ اور ”خلاف“ کے مابین فرق کو واضح کرتی ہے۔ اختلاف سے مراد رائے کا وہ علمی و فکری تنوع ہے جو دیانت داری اور دلائل پر مبنی ہو جبکہ خلاف سے مراد وہ عناد ہٹ دھرمی اور ضد ہے جو نفسانی خواہشات کے تابع ہو۔ اسی طرح ایک دائرہ ”علمی و فکری اختلاف“ کا ہوتا ہے جو علم کے ارتقا کا باعث بنتا ہے اور دوسرا دائرہ ”شخصی و جذباتی اختلاف“ کا ہوتا ہے جو معاشرے میں نفرت اور دوری کی بنیاد بنتا ہے۔ ایک متوازن سماج کے لیے ان دونوں کے مابین حدود کا تعین ناگزیر ہے۔

عصر حاضر کا سب سے بڑا المیہ ابلاغی آزادی اور سوشل میڈیا کا وہ بے لگام پھیلاؤ ہے جس نے ہر نازک علمی موضوع کو سر بازار لاکھڑا کیا ہے۔ اس مروجہ آزادی کے نتیجے میں وہ خالصتاً فرقہ وارانہ، کلامی اور فقہی مباحث جو اس سے قبل مساجد مدارس یا علمی حلقوں کے بند کمروں تک محدود تھے اب عوامی چوہاروں اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر زیر بحث ہیں۔ مناظرے بازی کی کچھ ایسی قبیح، کریہہ اور سطحی شکلیں سامنے آئی ہیں جو اخلاقی اور علمی وقار کے یکسر منافی ہیں۔ ٹی وی اور سوشل میڈیا کی سکرینوں پر سرعام دکھائی جانے والی یہ بحثیں علم کی ترویج کے بجائے معاشرتی انتشار اور فکری گراؤ کو فروغ دے رہی ہیں۔

عوامی سطح پر ہونے والے ان لاحاصل مناظروں کا ایک انتہائی سنگین اور منفی نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ جدید نوجوان نسل میں دین سے دوری اور بیزاری (repulsion) کا عمل تیز ہوتا جا رہا ہے۔ جب نوجوان ان ابلاغی فورمز پر اہل علم کو نہایت غیر اہم اور فروغی مسائل میں الجھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ ان مباحث کو سطحی اور حقیر سمجھ کر پورے دینی نظام سے متنفر ہونے لگتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض مسائل علمی و فقہی اعتبار سے اپنے خاص دائرے میں اہم ہوں، لیکن معاصر دنیا کے تناظر میں ان کی پوزیشن بدل جاتی ہے۔

اس وقت اُمتِ مسلمہ مجموعی طور پر ایک عالمگیر گہرے فکری اور سیاسی بحران (predicament) سے گزر رہی ہے۔ اس شدید معروضی دباؤ کے باعث نوجوان نسل یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اس ”پرچون سطح کی گفتگو“ اور فروغی نزاعات کا موجودہ عالمی حالات اور ان کے حقیقی مسائل سے کیا تعلق ہے! جب بڑے فکری چیلنجز، لادینیت کی لہروں اور جدید تہذیبی یلغار کا سامنا ہو تو اُمت کو فروغی اختلافات کی عینک اتار کر عالمگیر سطح کے بڑے چیلنجز پر سنجیدہ معقول اور سائنسی گفتگو کرنی چاہیے تاکہ نوجوان نسل کو فکری انتشار سے بچا کر ایک تعمیری رخ فراہم کیا جاسکے۔





# ترجمہ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمن خان مرحوم

## سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِيلَ

آیات ۵۳ تا ۵۷

﴿وَقُلْ لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۚ إِنَّ يَشَأْ يَرْجُمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۝ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۝ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَيْتُمْ مِّنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ۝﴾

ترجمہ:

|                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                            |                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                          |
|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| ﴿وَقُلْ لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۚ إِنَّ يَشَأْ يَرْجُمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۝ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۝ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَيْتُمْ مِّنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ۝﴾ | <p>وَقُلْ: آپ کہہ دیجیے</p> <p>يَقُولُوا الَّتِي: وہ لوگ کہیں جو کہ</p> <p>إِنَّ الشَّيْطَانَ: بے شک شیطان</p> <p>يَنْزِعُ: ان کے درمیان</p> <p>بَيْنَهُمْ: بے شک شیطان</p> <p>كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا: ہے انسان کے لیے</p> <p>رَبُّكُمْ: تمہارا رب</p> <p>أَعْلَمُ: تم لوگوں کو</p> <p>بِكُمْ: تم لوگوں کو</p> <p>إِنَّ يَشَأْ يَرْجُمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ: وہ لوگ کہیں جو کہ</p> <p>وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا: بے شک شیطان</p> <p>وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ: ان کے درمیان</p> <p>وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا: بے شک شیطان</p> <p>قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَيْتُمْ مِّنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا: ہے انسان کے لیے</p> <p>أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ: تمہارا رب</p> <p>إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا: تم لوگوں کو</p> |
|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|

يَزِيحُكُمْ: تو وہ رحم کرے گا تم پر  
يُعَذِّبُكُمْ: تو وہ تمہیں عذاب دے گا  
عَلَيْهِمْ وَكَيْلًا: ان پر کوئی نگہبان (بنا کر)  
أَعْلَمُ: سب سے زیادہ جاننے والا ہے  
فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ: آسمانوں اور زمین  
میں ہے  
بَعْضُ النَّبِيِّينَ: نبیوں کے بعض کو  
وَأَتَيْنَا: اور ہم نے دی  
زُبُورًا: زبور  
الَّذِينَ: ان کو جن کا  
مِنْ دُونِهِ: اُس کے علاوہ  
كَشَفَ الصُّرَّ: تکلیف کو کھولنے کا  
وَلَا تَحْوِيلًا: اور نہ ہی بدلنے کا  
يَذْعُونَ: یہ لوگ پکارتے ہیں  
إِلَى رَبِّهِمْ: اپنے رب کی طرف  
أَيُّهُمْ: (کہ) ان کا کون  
وَيَزِيحُونَ: اور وہ اُمید رکھتے ہیں  
وَيَخَافُونَ: اور وہ خوف کرتے ہیں  
إِنَّ: بے شک  
كَانَ: ہے

أَوَإِنْ يَشَاءُ: یا اگر وہ چاہے گا  
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ: اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو  
وَرَبُّكَ: اور آپ کا رب  
يَمُنُّ: اس کو جو  
وَلَقَدْ فَطَرْنَا: اور بے شک ہم نے فضیلت  
دی ہے  
عَلَى بَعْضٍ: بعض پر  
دَاوُدَ: داؤد کو  
قُلْ ادْعُوا: آپ کہیے: تم لوگ پکارو  
رَعْمَتُهُ: تمہیں زعم ہے  
فَلَا يَمْلِكُونَ: تو وہ اختیار نہیں رکھتے  
عَنْكُمْ: تم لوگوں سے  
أُولَئِكَ الَّذِينَ: وہ لوگ جن کو  
يَبْتَغُونَ: وہ (تو خود) تلاش کرتے ہیں  
الْوَسِيلَةَ: قربت کو  
أَقْرَبَ: زیادہ قریب (ہوتا) ہے  
رَحْمَتَهُ: اُس کی رحمت کی  
عَذَابَهُ: اُس کے عذاب کا  
عَذَابَ رَبِّكَ: آپ کے رب کا عذاب  
فَخَذُوا: کہ جس سے بچا جائے

**نوٹ ۱:** زیر مطالعہ آیت ۵۴ میں دعوت کے معاملے میں مومنین اور پیغمبر ﷺ کی ذمہ داری کی حد واضح فرمادی۔ فرمایا کہ یہ اللہ رب العزت ہی کو معلوم ہے کہ کون رحمت کا مستحق ہے اور وہ ہدایت پا کر رحمت کا مستحق ہوگا اور کون عذاب کا مستحق ہے اور وہ گمراہی پر جمے رہ کر عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔ پیغمبر ﷺ اور اس کے ساتھیوں پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ سب کو مومن بنادیں۔ ان پر ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی ہے۔ ماننا نہ ماننا ان کا کام ہے۔ (تذکر قرآن)

اس میں یہ بھی ہدایت ہے کہ اہل ایمان کی زبان پر کبھی ایسے دعوے نہیں آنے چاہئیں کہ ہم جنتی ہیں اور فلاں شخص یا فلاں گروہ دوزخی ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہی سب انسانوں کے ظاہر و باطن

اور ان کے حال مستقبل سے واقف ہے۔ اسی کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کس پر رحمت فرمائے اور کسے عذاب دے۔ انسان اصولی طور پر تو یہ کہنے کا مجاز ہے کہ کتاب اللہ کی رو سے کس قسم کے انسان رحمت کے مستحق ہیں اور کس قسم کے انسان عذاب کے مستحق ہیں، مگر یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں شخص کو عذاب دیا جائے گا اور فلاں شخص کو بخشا جائے گا۔ (تفہیم القرآن)

**نوٹ ۲:** آیت ۵۵ کا مطلب ہے کہ زمین و آسمان کے تمام انسان جنات اور فرشتوں کا اسے علم ہے۔ ان کے مراتب کا بھی اُسے علم ہے۔ ایک کو ایک پر فضیلت ہے۔ نبیوں میں بھی درجے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبیوں میں فضیلتیں نہ قائم کیا کرو۔ اس سے مراد تعصب اور نفیس پرستی سے اپنے طور پر فضیلت قائم کرنا ہے نہ یہ کہ قرآن و حدیث سے ثابت شدہ فضیلت سے بھی انکار۔ جو فضیلت جس نبی کی از روئے دلیل ثابت ہو اس کا ماننا واجب ہے۔ (ابن کثیر)

**نوٹ ۳:** آیت ۵۶ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔ کوئی دوسرا نہ کسی مصیبت کو ٹال سکتا ہے اور نہ کسی بُری حالت کو اچھی حالت سے بدل سکتا ہے۔ اس طرح کا اعتقاد اللہ تعالیٰ کے سوا جس ہستی کے بارے میں رکھا جائے، وہ ایک مشرک نہ عقیدہ ہے۔ آیت ۵۷ کے الفاظ خود گواہی دے رہے ہیں کہ مشرکین کے جن معبودوں اور فریادرسوں کا یہاں ذکر ہے ان سے مراد پتھر کے بت نہیں ہیں، بلکہ یا تو فرشتے ہیں یا گزرے ہوئے زمانے کے برگزیدہ انسان ہیں۔ مطلب صاف صاف یہ ہے کہ انبیاء ہوں یا اولیاء یا فرشتے، کسی کو بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ تمہاری دعائیں سنے اور تمہاری مدد کو پہنچے۔ تم حاجت روائی کے لیے ان کو وسیلہ بنا رہے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور قرب حاصل کرنے کے وسائل ڈھونڈ رہے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

## آیات ۵۸ تا ۶۰

﴿وَإِنْ مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَمَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا كَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ۝۵۸ وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۝۵۹ وَآتَيْنَا مُوسَى الْنَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۝۶۰ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ۝۶۱ وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۝۶۲ وَنُخَوِّفُهُمْ ۝۶۳ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ۝۶۴﴾

### ترکیب

(آیت ۵۹) اَرْسَلَ کا مفعول بنفسہ آتا ہے۔ اَلْآيَاتِ پر ب کا صلہ بتا رہا ہے کہ نُرْسِلَ کا مفعول محذوف ہے جو کہ الرُّسُولُ ہو سکتا ہے۔ مُبْصِرَةً صفت ہے اس کا موصوف آیتہ محذوف ہے۔ ظَلَمَ کا مفعول بھی بنفسہ آتا ہے۔ ہا کی ضمیر پر ب کا صلہ بتا رہا ہے کہ فَظَلَمُوا کا مفعول محذوف ہے جو کہ اَنْفُسُهُمْ ہو سکتا ہے۔ (آیت ۶۱)

وَجَعَلْنَا كَمَا مَفْعُولِ اَوَّلِ الرُّيَا هُجْبَةُ الشَّجَرَةِ الْمَلْعُونَةِ اس كَامَفْعُولِ ثَانِي هُجْبَةُ الشَّجَرَةِ الْمَلْعُونَةِ فِي الْقُرْآنِ اِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ۔  
وَمَا جَعَلْنَا الرُّيَا اِلَّا اَرِيْنَاكَ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ اِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ۔

### ترجمہ:

وَإِنْ : اور نہیں ہے  
إِلَّا نَحْنُ : مگر (یہ کہ) ہم  
قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَمَةِ : قیامت کے دن  
سے پہلے  
عَذَابًا شَدِيدًا : ایک سخت عذاب  
فِي الْكِتَابِ : کتاب میں  
وَمَا مَنَعَنَا : اور نہیں روکا ہم کو  
بِالْآيَاتِ : نشانیوں (یعنی معجزوں) کے ساتھ  
كَذَّبَ بِهَا : جھٹلایا ان (نشانوں) کو  
وَآتَيْنَا : اور ہم نے دی  
مُبْصِرَةً : ایک بینا کرنے والی (نشانی)  
ہوتے ہوئے  
بِهَا : اس (اونٹنی) کے سبب سے  
بِالْآيَاتِ : نشانیوں کے ساتھ  
وَإِذْ قُلْنَا : اور جب ہم نے کہا  
إِنَّ رَبَّكَ : (کہ) بے شک آپ کے رب نے  
وَمَا جَعَلْنَا : اور ہم نے نہیں بنایا  
أَرَيْنَاكَ : ہم نے دکھایا آپ کو  
لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے  
مِّنْ قَرِيَّةٍ : کوئی بھی بستی  
مُهْلِكُوهَا : ہلاک کرنے والے ہیں اس کو  
أَوْ مُعَذِّبُوهَا : یا عذاب دینے والے ہیں  
اس کو  
كَانَ ذَلِكَ : ہے یہ  
مَسْطُورًا : لکھا ہوا  
أَنْ تُرْسِلَ : کہ ہم بھیجیں (ان رسول کو)  
إِلَّا أَنْ : مگر (اس لیے) کہ  
الْأُولُونَ : پہلوں نے  
ثَمُودَ الثَّاقَةَ : ثمود کو اونٹنی  
فَقَظَلَمُوا : پھر انہوں نے ظلم کیا (اپنے آپ پر)  
وَمَا تُرْسِلُ : اور ہم نہیں بھیجتے (رسولوں کو)  
إِلَّا تَخْوِيفًا : مگر ڈرانے کو  
لَكَ : آپ سے  
أَحَاطَ بِالنَّاسِ : گھیرے میں لیا لوگوں کو  
الرُّيَا الْبَاطِلِ : اس خواب کو جو  
إِلَّا فِتْنَةً : مگر ایک آزمائش  
وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ : اور لعنت کیے ہوئے  
درخت کو (بھی)

فِي الْقُرْآنِ : جو قرآن میں ہے  
فَمَا يَزِيدُهُمْ : پھر وہ زیادہ نہیں کرتا ان کو  
وَنُحُوْفُهُمْ : اور ہم خوف دلاتے ہیں ان کو  
إِلَّا طُعْيَانًا كَيْبَرًا : مگر ایک بڑی سرکشی میں

**نوٹ :** ہر بستی کے ہلاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بقائے دوام کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ہر بستی کو یا تو طبعی موت مرنا ہے یا اللہ کے عذاب سے ہلاک ہونا ہے۔ (تفہیم القرآن)

**نوٹ ۲:** مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لائیں تو اس صفا پہاڑ کو سونے کا کر دیں، ہم آپ کی سچائی کے قائل ہو جائیں گے۔ آپ پر وحی آئی کہ اگر آپ کی بھی یہی خواہش ہو تو میں اس پہاڑ کو ابھی سونے کا بنا دیتا ہوں، لیکن اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو پھر انہیں مہلت نہیں ملے گی، فی الفور عذاب آجائے گا اور یہ تباہ کر دیے جائیں گے۔ اور اگر آپ کو انہیں سوچنے کا موقع دینا منظور ہے تو میں ایسا نہ کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میں انہیں باقی رکھنے میں ہی خوش ہوں۔ آیت ۵۹ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ (ابن کثیر)

**نوٹ ۳:** لفظ ”فتنة“ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بی بی عائشہؓ، حضرت معاویہؓ، حسنؓ اور مجاہدؓ وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جگہ (آیت ۶۰) فتنہ سے مراد فتنہ ارتداد لیا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے شب معراج میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر جانے اور صبح سے پہلے واپس آنے کا ذکر کیا تو کچھ نو مسلم لوگ جن میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اس بات کی تکذیب کر کے مرتد ہو گئے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لفظ ”رؤیا“ عربی زبان میں اگرچہ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن اس جگہ اس سے مراد خواب نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کے مرتد ہوجانے کی کوئی وجہ نہیں تھی، کیونکہ خواب تو ہر شخص ایسے دیکھ سکتا ہے بلکہ اس جگہ ”رؤیا“ سے مراد ایک واقعہ کو بحالت بیداری دکھانا ہے۔ (معارف القرآن)

لعنت کیے ہوئے درخت سے مراد ”زقوم“ ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ دوزخیوں کو زقوم کا درخت کھلایا جائے گا اور آپ نے اسے (شب معراج میں) دیکھا ہے تو کافروں نے اسے سچ نہ مانا اور مذاق اڑایا کہ دوزخ میں اتنی آگ ہوگی تو وہاں درخت کیسے اُگے گا۔ (ابن کثیر)

## آیات ۶۱ تا ۶۵

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ۖ قَالَ أَرَأَيْتَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ۖ قَالَ أَذْهَبَ مَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاءُكُمْ جَزَاءً مَوْفُورًا ۖ وَاسْتَغْفِرُ مَنْ اسْتَطَعَتْ مِنْهُمْ بِصُورَتِكَ وَأَجْلِبَ عَلَيْهِمْ بِخِيَلِكِ وَرَجِلِكَ وَشَارِكُهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدَّهُمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۖ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۖ وَكَفَى بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝﴾

**ح ن ک**

حَنَكَ يَحْنُكَ (ن) وَحَنَكَ يَحْنُكَ (ض) حَنَكًا: (۱) کسی چیز کو چبا کر نرم کرنا۔ (۲) گھوڑے کے منہ میں لگام دے کر اسے قابو میں کرنا۔

اِحْتَتَكَ (افتعال) اِحْتِنَاكَ: (۱) اہتمام سے چبا کر چٹ کر جانا، جیسے ٹڈی دل کاشت کو کھا کر صاف کر دیتا ہے۔ (۲) کسی پر غالب ہونا، پوری طرح قابو پانا۔ زیر مطالعہ آیت ۶۲۔

## و ف ر

وَفَرَّ يَفِرُّ (ض) وَفَرًا: زیادہ کرنا، پورا کرنا۔  
مَوْفُورٌ (اسم المفعول): پورا کیا ہوا، مکمل کیا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت ۶۳۔

## ف ز ز

فَزَّ يَفْزُ (ن) فَزًّا: ہوش اڑا دینا، کسی کو گھبرا کر اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔  
اِسْتَفَزَّ (استفعال) اِسْتَفَزَّا: مضطرب کر دینا، جگہ سے ہٹا دینا۔ زیر مطالعہ آیت ۶۴۔

## ص و ت

صَاتَ يَصُوتُ (ن) صَوًّا: آواز نکالنا۔  
صَوْتُ (ج أَصَوَاتٌ): آواز۔ زیر مطالعہ آیت ۶۴۔

## ج ل ب

جَلَبَ يَجْلِبُ (ن) وَجَلَبَ يَجْلِبُ (ض) جَلْبًا: (۱) ہانک کر لے آنا۔ (۲) زخم اچھا ہوتے وقت اس پر جھلی کا پردہ آنا۔

جَلَبَابٌ (ج جَلَابِيْبٌ): چادر، اوڑھنی۔ ﴿يُذْنِبْنَ عَلَيْهِنَ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ط﴾ (الاحزاب: ۵۹)  
”وہ خواتین نزدیک کر لیں اپنے اوپر اپنی اوڑھنیوں میں سے۔“

أَجْلَبَ (افعال) اِجْلَابًا: ہانک کر لے آنا، چڑھا لانا۔ زیر مطالعہ آیت ۶۴۔

## ت ر ک ی ب

(آیت ۶۲) اَزَّيْتَكَ میں ضمیر ”ک“، ضمیر مفعولی نہیں بلکہ ضمیر زائدہ ہے اور اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔  
یہ پورا فقرہ عربی محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ”بھلا دیکھ تو سہی۔“ قَلِيلًا کے آگے مِنْهُمْ محذوف ہے۔  
(آیت ۶۳) اِذْهَبْ کے آگے اَنْتَ مُؤَخَّرٌ محذوف ہے۔

## ت ر ج م ہ:

وَإِذْ قُلْنَا: اور جب ہم نے کہا  
اِسْجُدْوا: تم لوگ سجدہ کرو  
فَسَجَدُوا: تو انہوں نے سجدہ کیا  
قَالَ: اس نے کہا  
لِمَنْ: اس کو جسے  
لِلْمَلٰئِكَةِ: فرشتوں سے  
لَا دَمَ: آدم کو  
إِلَّا ابْلِيسَ: سوائے ابلیس کے  
ءِ اَسْجُدْ: کیا میں سجدہ کروں  
خَلَقْتُ: تُو نے پیدا کیا

طِينًا: مٹی سے

أَرَأَيْتَكَ: بھلا تو دیکھتو سہی

كَرَّمْتُ: تُو نے معزز کیا

لَيْتَنِي: یقیناً اگر

إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ: قیامت کے دن تک

دُرِّيَّةً: اس کی اولاد پر

قَالَ: (اللہ نے) کہا

فَمَنْ تَبِعَكَ: پس جو پیروی کرے گا تیری

فَإِنَّ جَهَنَّمَ: تو یقیناً جہنم

جَزَاءً مَوْفُورًا: مکمل بدلہ ہوتے ہوئے

مَنْ اسْتَطَاعَ: اس کو جس پر تیرا بس چلے

بِصَوْتِكَ: اپنی آواز سے

يَعْيِلُكَ: اپنے سواروں کو

وَسَارِيَهُمْ: اور ساتھی بن ان کا

وَالْأَوْلَادِ: اور اولاد میں

وَمَا يَعِدُهُمْ: اور وعدہ نہیں دیتا ان کو

إِلَّا غُرُورًا: سوائے فریبوں کے

لَيْسَ لَكَ: نہیں ہے تیرے لیے

سُلْطَنٌ: کوئی اختیار

بِرَبِّكَ: آپ کا رب

قَالَ: اس نے کہا

هَذَا الَّذِي: یہ وہ ہے جس کو

عَلَى: مجھ پر

أَخَّرْتَنِي: تُو نے مہلت دی مجھ کو

لَأَحْتَنِكَنَّ: تو میں لازماً قابو پا لوں گا

إِلَّا قَلِيلًا: سوائے تھوڑے سے (ان میں سے)

أَذْهَبَ: دفع ہو جا (تو مہلت دیا ہوا ہے)

مِنْهُمْ: ان میں سے

جَزَاءً وَكُفًّا: تم لوگوں کا بدلہ ہے

وَاسْتَفْزِرُ: اور ٹوڑمگا لے

مِنْهُمْ: ان میں سے

وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ: اور تو چڑھالا ان پر

وَرَجْلِكَ: اور اپنے پیادوں کو

فِي الْأَمْوَالِ: مالوں میں

وَعِدَهُمْ: اور تُو وعدہ دے ان کو

الشَّيْطَانُ: شیطان

إِنَّ عِبَادِي: بے شک میرے بندے (جو ہیں)

عَلَيْهِمْ: ان پر

وَكَفَى: اور کافی ہے

وَكَيْلًا: بطور کارساز

## آیات ۶۶ تا ۷۰

﴿رَبُّكُمُ الَّذِي يُرْجِي لَكُمْ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِيَتَّبِعُوكُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۖ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝۶۶﴾

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّيْكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۖ

وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ۝۶۷ أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يُخَسِّفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ

حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا الْكُفَّ وَالْكَفَّ وَكَيْلًا ۝۶۸ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ

عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيحِ فَيُغَرِّقَكُم مِّمَّا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا الْكُفَّ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ۝۶۹﴾

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴿٥٠﴾

## ح ص ب

حَصَبٌ يَحْصِبُ (ن) وَحَصَبٌ يَحْصِبُ (ض) حَصْبًا: کنکری سے مارنا، فرش بنانے کے لیے چھوٹے پتھر بچھانا۔

حَصَبٌ (اسم ذات): چھوٹے پتھر، ایندھن۔ ﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (الانبیاء: ۹۸) ”بے شک تم لوگ اور وہ جس کی تم لوگ پرستش کرتے ہو اللہ کے علاوہ (وہ سب) جہنم کا ایندھن ہیں۔“

حَاصِبٌ (اسم الفاعل): کنکری مارنے والا۔ پھر زیادہ تر کنکریاں اڑانے والی تند ہوا کے لیے آتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۶۸۔

## ت ع ر

تَأْرَأْتُمْ (ف) تَأْرَأُ: جھڑکنا، دھمکانا۔  
تَأْرَةً: ایک مرتبہ ایک دفعہ (کثرت استعمال کی وجہ سے اس کا ہمزہ الف میں تبدیل ہو گیا ہے) زیر مطالعہ آیت ۶۹۔

## ق ص ف

قَصَفَ يَقْصِفُ (ض) قَصْفًا: کسی چیز کو توڑنا۔  
قَاصِفٌ (اسم الفاعل): توڑنے والا۔ پھر زیادہ تر درختوں اور عمارتوں کو توڑ دینے والی شدید ہوا کے لیے آتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۶۹۔

## ترجمہ:

|                                           |                                                 |
|-------------------------------------------|-------------------------------------------------|
| رَبُّكُمْ: تمہارا رب                      | الَّذِي يُزَيِّجُ: وہ ہے جو چلاتا ہے            |
| لَكُمْ الْفُلُك: تمہارے لیے شہتی کو       | فِي الْبَحْرِ: سمندر میں                        |
| لِتَبْتَغُوا: تاکہ تم لوگ تلاش کرو        | مِنْ فَضْلِهِ: اس کے فضل میں سے                 |
| إِنَّهُ كَانَ: بے شک وہ ہے                | بِكُمْ: تم لوگوں پر                             |
| رَحِيمًا: ہر حال میں رحم کرنے والا        | وَإِذَا: اور جب بھی                             |
| مَسْكُومٌ: چھوٹی ہے تم لوگوں کو           | الضَّرُّ: تکلیف (یعنی آفت)                      |
| فِي الْبَحْرِ: سمندر میں                  | ضَلَّ: تو گم ہو جاتے ہیں                        |
| مَنْ تَدْعُونَ: وہ جن کو تم لوگ پکارتے ہو | إِلَّا آيَاتُ: مگر اُس (اللہ) کو ہی (پکارتے ہو) |



فَلَمَّا تَجَسَّكُمْ: پھر جب وہ نجات دیتا ہے تم کو  
 أَعْرَضْتُمْ: تو تم لوگ بے رخی برتتے ہو  
 كَفُورًا: بے انتہا ناشکری کرنے والا  
 أَنْ يَنْفُسَ: (اس سے) کہ وہ دھنسا دے  
 جَانِبَ الْبَرِّ: خشکی کے کنارے کو  
 عَلَيْكُمْ: تم لوگوں پر  
 ثُمَّ لَا تَجِدُوا: پھر تم لوگ نہیں پاؤ گے  
 أَمْ أَمِنْتُمْ: یا تم لوگ امن میں ہو  
 يُعِيدُكُمْ: واپس لے جائے تم کو  
 تَارَةً أُخْرَى: دوسری مرتبہ  
 عَلَيْكُمْ: تم لوگوں پر  
 مِنَ الرِّيحِ: ہواؤں میں سے  
 يَمَّا: بسبب اس کے جو  
 ثُمَّ لَا تَجِدُوا: پھر تم لوگ نہیں پاؤ گے  
 عَلَيْنَا: ہمارے خلاف  
 تَبِيعًا: کوئی پیچھے لگنے والا  
 بَنَى آدَمَ: آدمؑ کے بیٹوں کو  
 فِي الْبَرِّ: خشکی میں  
 وَرَزَقْنَاهُمْ: اور ہم نے رزق دیا ان کو  
 وَفَضَّلْنَاهُمْ: اور ہم نے فضیلت دی ان کو  
 مِّنْ: ان میں سے جن کو  
 تَفْضِيلًا: جیسے فضیلت دیتے ہیں

## آیات ۱۷ تا ۲۷

﴿يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمامِهِمْ ۚ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ  
 وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝۱۸ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝۱۹ وَإِنْ  
 كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَةً ۚ وَإِذَا لَا تُمْخِذُونَكَ

خَلِيلًا ۞ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدَّتْ تَرَكُنْ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۞ إِذَا لَا دُفْنَكَ  
 ضَعُفَ الْحَيَوةِ وَضَعُفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۞ وَإِنْ كَادُوا لِيَستَفِزُّوكَ  
 مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذَا لَا يَلْبِثُونَ خَلْفَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۞ سُنَّةٌ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا  
 قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۞

ترجمہ:

|                                              |                                                    |
|----------------------------------------------|----------------------------------------------------|
| يَوْمَ نَذَعُوْا: جس دن ہم بلائیں گے         | كُلَّ اُنَّاسٍ: ہر گروہ کو                         |
| بِاِمَامِهِمْ: ان کے ریکارڈ کے ساتھ          | فَمَنْ اُوْتِيَ: پس وہ جس کو دی گئی                |
| كِتٰبَةٍ: اس کی کتاب                         | بِیَمِیْنِهِ: اس کے داہنے ہاتھ میں                 |
| فَاُولٰٓئِكَ: تو وہ لوگ                      | يَقْرَءُوْنَ: پڑھیں گے                             |
| كِتٰبَهُمْ: اپنی کتاب کو                     | وَلَا يُظْلَمُوْنَ: اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا |
| فَتَبَيَّلًا: کسی دھاگے برابر بھی            | وَمَنْ كَانَ: اور وہ جو تھا                        |
| فِيْ هَذِهِ: اس (دنیا) میں                   | اَعْمٰی: اندھا                                     |
| فَهُوَ: تو وہ                                | فِي الْاٰخِرَةِ: آخرت میں (بھی)                    |
| اَعْمٰی: اندھا ہوگا                          | وَاَصْلُ: اور (وہ) زیادہ گمراہ ہوگا                |
| سَبِيْلًا: بلحاظ راستہ کے                    | وَإِنْ كَادُوا: اور بے شک وہ لوگ قریب تھے کہ       |
| لَيَفْتِنُوْكَ: وہ ضرور پھسلا دیں گے آپ کو   | عَنِ الَّذِيْ: اس سے جو                            |
| اَوْحَيْنَا: ہم نے وحی کیا                   | إِلَيْكَ: آپ کی طرف                                |
| لِتَفْتَرِيَ: تاکہ آپ گھڑیں                  | عَلَيْنَا: ہم پر                                   |
| غَيْرَهُ: اس (وحی) کے علاوہ                  | وَإِذَا: اور تب تو                                 |
| لَا تَجِدُوكَ: وہ ضرور بنالیں گے آپ کو       | خَلِيلًا: ایک قریبی دوست                           |
| وَلَوْلَا: اور اگر نہ ہوتا                   | أَنْ ثَبَّتْنَاكَ: کہ ہم جمادیں آپ کو              |
| لَقَدْ كِدَّتْ: تو بے شک آپ قریب ہو چکے      | تَرَكُنْ: آپ مائل ہو جائیں                         |
| تھے کہ                                       |                                                    |
| إِلَيْهِمْ: ان کی طرف                        | شَيْئًا قَلِيْلًا: تھوڑا سا                        |
| إِذَا: تب تو                                 | لَا دُفْنَكَ: ہم ضرور چکھاتے آپ کو                 |
| ضِعْفَ الْحَيَوةِ: زندگی (کے عذاب) کا دو گنا | وَضِعْفَ الْمَمَاتِ: اور موت (کے عذاب)             |
|                                              | کا دو گنا                                          |

ثُمَّ لَا تَجِدُ: پھر آپ نہ پاتے

نَصِيْرًا: کوئی مدد کرنے والا

لَيْسَتْ فِرْزُوكَ: وہ ضرور اکھاڑ دیں آپ کو

لِيُخْرِجُوكَ: تاکہ وہ لوگ نکال دیں آپ کو

وَإِذَا لَا يَلْبِثُونَ: اور تب تو وہ لوگ نہ ٹھہرتے

إِلَّا قَلِيْلًا: مگر تھوڑا سا

لَكَ عَلَيْنَا: اپنے لیے ہمارے خلاف

وَإِنْ كَاذِبًا: اور بے شک وہ لوگ قریب تھے کہ

مِنَ الْأَرْضِ: اس زمین (یعنی مکہ) سے

مِنْهَا: اس (زمین) سے

خَلَقَكَ: آپ کے پیچھے

سُنَّةَ مَنْ: (آپ مستحضر رکھیں) ان کی سنت

کو جن کو

قَدْ أَرْسَلْنَا: ہم بھیج چکے ہیں

مِنْ رُسُلِنَا: اپنے پیغمبروں میں سے

لِنُسَنِّيَنَّا: ہماری سنت کے لیے

قَبْلَكَ: آپ سے پہلے

وَلَا تَجِدُ: اور آپ نہیں پائیں گے

تَحْوِيلًا: کوئی تبدیلی کرنا

**نوٹ ۱:** البقرة: ۷۸ کی لغت میں ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید میں لفظ ”امام“ تین معانی میں استعمال ہوا ہے:

(۱) راستہ، (۲) ریکارڈ اور (۳) پیشوا۔ ہم نے جو بھی دو چار تفاسیر دیکھی ہیں ان سب نے زیر مطالعہ آیت ۷۸

میں بِأَمَامِهِمْ کا ترجمہ کیا ہے: ”ان کے امام: سرداروں / پیشواؤں کے ساتھ۔“ ابن کثیرؒ کے مترجم نے بھی یہی

ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ امام سے مراد یہاں نبی ہیں۔ ہر اُمت قیامت کے

دن اپنے نبی کے ساتھ بلائی جائے گی۔ ابن زیدؒ کہتے ہیں یہاں امام سے مراد کتاب خدا ہے جو ان کی شریعت کے

بارے میں اُتری تھی۔ ابن جریرؒ اس تفسیر کو بہت پسند فرماتے ہیں اور اسی کو مختار کہتے ہیں۔ مجاہدؒ کہتے ہیں اس سے

مراد ان کی کتابیں ہیں۔ ممکن ہے کتاب سے مراد یا تو احکام کی کتاب خدا ہو یا نامہ اعمال ہو۔ چنانچہ ابن عباسؒ

اس سے اعمال نامہ مراد لیتے ہیں۔ ابو العالیہؒ حسنؒ اور ضحاکؒ بھی یہی کہتے ہیں اور یہی زیادہ ترجیح والا قول ہے۔

ابن کثیرؒ کی اس تفسیر کی بنیاد پر ہم نے بِأَمَامِهِمْ کا ترجمہ کیا ہے ”ان کے ریکارڈ کے ساتھ۔“

**نوٹ ۲:** مخالفین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ اگر فلاں فلاں احکام میں ترمیم کر دیں تو ہم یہ

دعوت قبول کر لیتے ہیں، پھر ہم اور آپ گہرے دوست بن کر رہیں گے۔ آپ کے لیے یہ بڑا ہی سخت مرحلہ تھا۔ ایک

طرف اللہ تعالیٰ کے احکام تھے جن میں ایک لفظ کے برابر بھی آپ ترمیم کرنے کے مجاز نہ تھے۔ دوسری طرف آپ

اپنی قوم کے ایمان کی شدید خواہش رکھتے تھے اور کسی ایسے موقع کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے تھے جس سے قوم

کے ایمان کی راہ پر پڑنے کی امید بندھتی ہو۔ اس صورت حال نے آپ کو تذبذب میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے

اس نازک مرحلے میں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دستگیری فرمائی اور آپ کو تذبذب سے نکال کر صحیح شاہراہ پر کھڑا کر دیا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کو کوئی تذبذب کی حالت پیش نہیں آتی یا کوئی

غلط میلان اس کے دل میں فطور نہیں کرتا بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اوّل تو اس کا میلان کبھی جانبِ نفس نہیں

ہوتا بلکہ ہمیشہ خیر کی جانب ہوتا ہے دوسرے یہ کہ جانب خیر میں بھی اگر وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتا نظر آتا ہے جو صحیح نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کو بچا لیتا ہے اور صحیح سمت میں اس کی رہنمائی فرما دیتا ہے۔ (تدبر قرآن)

## آیات ۷۸ تا ۸۴

﴿اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوْكَ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝۷۸ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹ وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝۸۰ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَلَا يَزِيْدُ الظَّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝۸۲ وَاِذَا اَنْعَمْنَا عَلٰى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَتَأْبٰىجَانِيْهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَكُوْسًا ۝۸۳ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۚ فَرُبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝۸۴﴾

### دلک

دَلَّكَ يَدُلُّكَ (ن) دَلَّكَ: ملنا، رگڑنا۔  
دُلُوْكًَا: جھلنا، ڈھلنا۔ زیر مطالعہ آیت ۷۸۔

### غسق

غَسَقَ يَغْسِقُ (ض) غَسَقًا: تاریک ہونا، اندھیرا ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۷۸۔  
غَاسِقٌ (اسم الفاعل): تاریک ہونے والا۔ ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳﴾ (الفلق) ”اور تاریک ہونے والے کے شر سے جب وہ گہرا ہو۔“  
غَسَقَ يَغْسِقُ (س) غَسَقًا: آنکھ میں آنسو ڈبانا، زخم میں پیپ بھرنا۔  
غَسَاقٌ: بار بار بھرنے والی یعنی بننے والی پیپ۔ ﴿وَلَا شَرَابًا ۝۳ اِلَّا حَمِيْمًا وَّعَسَاقًا ۝۲۵﴾ (النبأ)  
”اور نہ ہی پینے کی کوئی چیز، سوائے گرم پانی کے اور پیپ کے۔“

### ہج

هَجَدَ يَهْجُدُ (ن) هُجُوْدًا: (۱) نیند میں سونا۔ (۲) نیند سے جاگنا۔  
تَهَجَّدَ (تفعل) تَهَجَّدًا: (۱) بتکلف ہونا۔ (۲) بتکلف جاگنا، بیدار رہنا۔ زیر مطالعہ آیت ۷۹۔

### شکل

شَكَلٌ يَشْكُلُ (ن) شَكْلًا: شکل و صورت میں مشابہت ہونا، ملتا جلتا ہونا۔ ﴿وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖ

اَزْوَاجٍ ﴿٥٨﴾ (ص) ”اور دوسرے اس کے ملتے جلتے سے کچھ جوڑے۔“

شَاكِكَةً (اسم الفاعل شَاكِكٌ کا مؤنث): مشابہ ہونے والی۔ پھر اس سے مراد لیتے ہیں آدمی کی طبیعت و مزاج کیونکہ اس کا عمل اس کے مطابق ہوتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۸۴۔

### ترکیب

(آیت ۷۸) قُرْآن کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ اَقِمّ پر عطف ہے۔ (آیت ۷۹) فَتَهَجَّدْ بِہ میں ۵ کی ضمیر قُرْآن کے لیے ہے۔ مَقَامًا مَّحْمُودًا ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت ۸۰) مادہ ”دخ ل“ سے باب افعال میں اِذْخَالًا کے علاوہ ایک مصدر مُدْخَلًا بھی آتا ہے۔ جبکہ باب افعال میں اس کا اسم المفعول بھی مُدْخَلٌ ہے جو کہ ظرف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے مُدْخَلٌ صِدْقِ کے دونوں طرح کے ترجمے درست ہوں گے۔ ہم مصدر کے لحاظ سے ترجمہ کو ترجیح دیں گے۔ اسی طرح مُخْرِجٌ صِدْقِ کا ترجمہ بھی مصدر کے لحاظ سے کریں گے۔ (آیت ۸۲) وَلَا يَزِيدُ میں شامل هُوَ کی ضمیر فاعلی الْقُرْآنِ کے لیے ہے۔

### ترجمہ:

اَقِمِ الصَّلَاةَ: آپ قائم کریں نماز کو  
اِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ: رات کے تاریک ہونے تک  
اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ: بے شک فجر کا قرآن  
وَمِنَ اللَّيْلِ: اور رات میں سے  
بہ: اس (قرآن) کے ساتھ  
عَسَى: ہو سکتا ہے  
رُبُّكَ: آپ کا رب  
وَقُلْ رَبِّ: اور آپ کہیے: اے میرے رب  
مُدْخَلٌ صِدْقِ: سچائی کا داخل کرنا  
مُخْرِجٌ صِدْقِ: سچائی کا نکالنا  
مِنْ لَّدُنْكَ: اپنے پاس سے  
وَقُلْ: اور آپ کہیے  
وَرَهَقَ الْبَاطِلُ: اور نابود ہوا باطل  
كَانَ زُهُوفًا: ہے بالکل نابود ہونے والا  
مِنَ الْقُرْآنِ: قرآن میں سے  
شِفَاءً وَرَحْمَةً: شفا ہے اور رحمت ہے

لِدُلُوكِ الشَّمْسِ: سورج کے ڈھلنے سے  
وَقُرْآنَ الْفَجْرِ: اور فجر کے قرآن کو (قائم کریں)  
كَانَ مَشْهُودًا: ہے موجود کیا ہوا  
فَتَهَجَّدْ: پھر آپ بیدار رہیں  
تَأْفِلَةً لَّكَ: اضافی ہوتے ہوئے آپ کے لیے  
اَنْ يَّبْعَثَكَ: کہ پہنچائے آپ کو  
مَقَامًا مَّحْمُودًا: مقامِ محمود تک  
اَدْخِلْنِي: تُو داخل کر مجھ کو  
وَاَخْرِجْنِي: اور تُو نکال مجھ کو  
وَاجْعَلْ لِّي: اور تُو بنادے میرے لیے  
سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا: ایک مددگار قوت  
جَاءَ الْحَقُّ: آیا حق  
اِنَّ الْبَاطِلَ: بے شک باطل  
وَنُذِّلُّ: اور ہم اُتارتے ہیں  
مَا هُوَ: اس کو جو  
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: ایمان لانے والوں کے لیے

وَلَا يَزِيدُ: اور وہ (یعنی قرآن) زیادہ نہیں کرتا

إِلَّا حَسْرًا: مگر بلحاظ خسارے کے

أَنْعَمْنَا: ہم نعمت نچھاور کرتے ہیں

أَعْرَضَ: تو وہ منہ پھیر لیتا ہے

وَإِذَا: اور جب بھی

كَانَ يَتُوسَّ: تو وہ ہوتا ہے انتہائی مایوس

كُلُّ يَتَعَمَلُ: سب (لوگ) عمل کرتے ہیں

فَرَبُّكُمْ: تو تم لوگوں کا رب

يَمُنْ هُوَ: اس کو جو

سَدِيدًا: بلحاظ راستے کے

**نوٹ ۱:** آیت ۷۸ میں مجمل یہ بتا دیا گیا کہ بیچ وقت نماز جو معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی اس کے اوقات کی

تنظیم کس طرح کی جائے۔ حکم ہوا کہ ایک نماز تو طلوع آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے اور باقی چار نمازیں زوال

آفتاب کے بعد سے ظلمت شب تک پڑھی جائیں۔ پھر اس حکم کی تشریح کے لیے جبریلؑ بھیجے گئے جنہوں نے نماز

کے ٹھیک اوقات کی تعلیم نبی ﷺ کو دی۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جبریلؑ نے دو مرتبہ مجھ کو بیت اللہ کے

قریب نماز پڑھائی۔ پہلے دن ظہر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ سورج ابھی ڈھلا ہی تھا اور سایہ ایک جوتی کے تسے

سے زیادہ دراز نہ تھا۔ پھر عصر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد کے برابر تھا۔ پھر مغرب کی

نماز ٹھیک اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے۔ پھر عشاء کی نماز شفق غائب ہوتے ہی پڑھا دی اور

فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن انہوں نے ظہر کی نماز مجھے اس

وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد کے برابر تھا اور عصر کی نماز اس وقت جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد سے

دو گنا ہو گیا۔ مغرب کی نماز اس وقت جبکہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے اور عشاء کی نماز ایک تہائی رات گزر جانے پر

اور فجر کی نماز اچھی طرح روشنی پھیل جانے پر۔ پھر جبریلؑ نے پلٹ کر مجھ سے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ یہی اوقات

انبیاء کرام ﷺ کے نماز پڑھنے کے ہیں اور نمازوں کے صحیح اوقات ان دونوں وقتوں کے درمیان ہیں۔ (تفہیم القرآن)

**نوٹ ۲:** مقام محمود تک پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے جہاں آپ ﷺ

محمود خلاق ہو کر رہیں۔ ہر طرف سے آپ پر مدح و ستائش کی بارش ہو۔ آج آپ کے مخالفین نے آپ کو بدنام

کرنے کے لیے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے، مگر وہ وقت دور نہیں ہے جب دنیا آپ کی تعریفوں

سے گونج اٹھے گی اور آخرت میں بھی آپ ساری خلق کے ممدوح ہوں گے۔ قیامت کے دن نبی مکرم ﷺ کا

مقام شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبہ محمودیت کا ایک حصہ ہے۔ (تفہیم القرآن) ❀❀❀

# مِلاکُ التَّأْوِيلِ (۴۵)

تالیف: ابو جعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی  
تلخیص و ترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

## سُورَةُ لقْمَن

(۲۹۱) آیت ۷

﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَن فِي أذْنَيْهِ وَقَرَّ ۖ فَبَسَّ بِهٖزَّةٍ يَّعَذَابٍ ۖ أَلِيمٍ ۝۷﴾

”اور جب اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ بڑے تکبر سے منہ پھیر لیتا ہے جیسے کہ اس نے انہیں سنا ہی نہیں، جیسے کہ اس کے دونوں کانوں میں ڈاٹ ہے، تو اسے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔“

اور سورۃ الجاثیہ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيَلِّ لِكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝۷ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۖ فَبَسَّ بِهٖزَّةٍ يَّعَذَابٍ ۖ أَلِيمٍ ۝۸﴾

”بربادی ہے ہر بہتان تراش گنہگار کے لیے۔ وہ اللہ کی آیات سنتا ہے جو اس پر پڑھی جا رہی ہیں پھر بھی غرور کی بنا پر اڑاڑ ہوتا ہے گویا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں، تو پھر اسے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو!“

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ سورۃ لقمان کی آیت میں خاص طور پر یہ کیوں کہا گیا: ﴿كَأَن فِي أذْنَيْهِ وَقَرَّ ۖ﴾ ”گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں ڈاٹ ہے“؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ الجاثیہ کی آیت میں صاف طور پر بتایا گیا تھا کہ یہ شخص جو بہتان تراش ہے، گناہگار ہے، اللہ کی آیات کو سنتا ہے جب وہ اس پر پڑھی جاتی ہیں، تو یہاں کان کے بند ہونے کا ذکر مناسب نہ تھا، کیونکہ اگر کان میں ڈاٹ لگا ہو تو وہ کیسے سن پائے گا؟

کوئی یہ کہے کہ اگر یہاں بھی کان میں ڈاٹ لگے جانے کا ذکر ہوتا تو بھی اس کا یہی مطلب ہوتا کہ یہ شخص واقعی سننا نہیں چاہتا بلکہ بھانگنا چاہتا ہے۔ جواب میں ہم کہیں گے کہ اگر اسے تاکید کی بیان سمجھا جائے تب بھی یہ تو سمجھا جائے گا کہ وہ سن نہیں پایا تھا لیکن اس آیت کے الفاظ تو یہ بتا رہے ہیں کہ اس نے سنا تھا اور اس کے باوجود

منہ پھیر رہا تھا، گویا کہ اس نے نہیں سنا۔ اس کی یہ حالت یہود کی سی ہے جن کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا:

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنۢ بَعدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (البقرة)

”اور ان میں سے ایک جماعت اللہ کا کلام سنتی ہے اور پھر اسے سمجھنے کے باوجود اسے بدل کے رکھ دیتی ہے، حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں۔“

اور اگر مقصود یہ بتانا ہو کہ وہ اصل میں توسن رہے تھے لیکن اُن سنی کر رہے تھے تو پھر ایسے تاکید کی الفاظ لانا تو مناسب نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ سننے کے قابل نہیں تھے۔

سورۃ لقمان کے آغاز میں بھی سماع آیات کا ذکر نہیں ہے، لیکن یہ کہا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا﴾ (آیت ۶)

”اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو فضول باتوں کو خریدتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے بغیر علم کے اللہ کے راستے سے بہکایا جائے اور اسے ہنسی مذاق کا نشانہ بنایا جائے۔“

یہاں ان کی مزید ایک اور نامناسب حرکت کا بیان ہوا تو اس سے بھی کان میں ڈاٹ لگے جانے کی تاکید ہو گئی، حالانکہ یہاں سماع آیات کا سرے سے نہیں ذکر ہوا جیسے کہ سورۃ الجاثیہ کی آیت میں کیا گیا تھا۔ یوں واضح ہو گیا کہ سورۃ لقمان کی آیت میں جو بات خاص طور پر بیان ہوئی وہ بالکل مناسب تھی اور اگر اس کا الٹ کیا جاتا تو وہ بالکل غیر مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

(۲۹۲) آیت ۱۷

﴿يُنذِرُ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَآمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْدِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (۱۷)

”اے میرے چھوٹے بیٹے! نماز قائم کرنا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا اور جو مصیبت آئے اس پر صبر کرنا۔ یقیناً یہ سب بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہیں۔“

اور سورۃ الشوریٰ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (۳۳)

”اور جو صبر کرتا ہے اور معاف کرتا ہے تو یہ بہت بہت ہمت کے کاموں میں سے ہے۔“

سوال کیا جاتا ہے کہ دوسری آیت میں ”صَبَرَ“ پر لام تاکید لایا گیا ہے، جبکہ پہلی آیت میں ایسا نہیں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ الشوریٰ کی آیت میں ”صَبَرَ وَغَفَرَ“ سے قبل لَمَن (لام تاکید) لایا گیا ہے کہ جس میں قسم کا معنی پنہاں ہے، تو مناسب تھا کہ ”إِنَّ“ کی خبر میں بھی لام تاکید کے ساتھ



”لَمَّا عَزَمَ الْأُمُورَ“ کہا جاتا۔ آیت کا ظاہر بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔ لیکن سورۃ لقمان کی آیت میں اس طرح کسی قسم کا مضمون پنہاں نہیں ہے، صرف چند وصیتوں کا بیان ہوا ہے تو یہاں لام تا کید لائے جانے کی نہ کوئی طلب تھی اور نہ ہی قسمیہ انداز کو اپنانے کی حاجت تھی۔ اس لیے ہر دو آیات اپنی اپنی جگہ مناسب رہتی ہیں۔

(۲۹۳) آیت ۲۹

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُوسِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوسِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلًّا يَجْرِئُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (۲۹)

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور اُس نے سورج اور چاند کو فرماں بردار بنادیا ہے، ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت کی طرف رواں دواں ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

اور سورۃ فاطر میں ارشاد فرمایا:

﴿يُوسِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوسِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلًّا يَجْرِئُ لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ط ذَٰلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمُ﴾ (آیت ۱۳)

”وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور اسی نے سورج اور چاند کو فرماں بردار بنا رکھا ہے، ہر ایک مقررہ مدت کی طرف رواں دواں ہے۔ یہی وہ ذات تمہارے رب کی ہے۔“

اور سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿يَكُونُ اللَّيْلُ عَلَى النَّهَارِ وَيَكُونُ النَّهَارُ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلًّا يَجْرِئُ لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ط أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ﴾ (۵)

”وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے، اور سورج اور چاند کو فرماں بردار بنا کر رکھتا ہے۔ ہر ایک اپنی مقررہ مدت کی طرف رواں دواں ہے۔ بے شک وہ غلبے والا، معاف کرنے والا ہے۔“

سوال یہ ہے کہ سورۃ لقمان میں ”إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى“ یعنی ”إِلَىٰ“ (حرف جر) کے ساتھ کہا گیا اور باقی دونوں سورتوں میں اس کی جگہ لام (حرف جر) لایا گیا، یعنی ”لِأَجَلٍ مُّسَمًّى“ کہا گیا، تو یہ فرق کیوں روا رکھا گیا جب کہ معنی تو ایک ہی تھا؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ لقمان میں آیت کی ابتدا ”أَلَمْ تَرَ“ (کیا تم نہیں دیکھتے!) کے الفاظ سے ہو رہی ہے اور اس کے بعد واؤ نسق کے ساتھ دن رات کے آنے جانے اور سورج چاند کے اطاعت گزار رہنے کا تذکرہ ہے، اور اس واؤ کی بنا پر ”أَلَمْ تَرَ“ کے الفاظ سے جس تنبیہ یا توجہ دلائے جانے کا انداز اپنایا گیا ہے وہ اس آیت کے تمام مضامین پر حاوی ہے۔ گویا یہاں مضمون میں طوالت پائی گئی اور ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اگر مضمون طویل ہو تو اس میں الفاظ کی زیادتی مناسب ہوتی ہے اور جہاں مضمون مختصر ہو وہاں الفاظ کے چناؤ میں بھی اختصار کے ساتھ کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ لقمان میں بجائے ”لام“ کے، اسی معنی کو

’ای‘ کے ساتھ تعبیر کیا گیا کہ ’ای‘ سے حرفی لفظ ہے جب کہ لام صرف ایک ہی حرف ہے۔ باقی دونوں سورتوں میں چونکہ اختصار تھا اس لیے وہاں صرف لام حرکالا نا ہی مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

(۲۹۴) سورة السجدة کی آیت ۲۰ اور سورة سبا کی آیت ۴۲ کے مابین ضمائر کے اختلاف کا بیان فقرہ نمبر ۲۵۸ (سورة الحج آیت ۲۲) کے ضمن میں تفصیلی طور پر آچکا ہے اس لیے یہاں اس کا اعادہ نہیں کیا جا رہا ہے۔

## سُورَةُ الاحزاب

(۲۹۵) آیت ۸

﴿لَيْسَ لِّلْضِدِّقِيْنَ عَن صِدْقِهِمْ ۚ وَّأَعَدَّ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۸﴾

”تا کہ اللہ سچ بولنے والوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور اس نے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

اور اسی سورت میں آگے ارشاد فرمایا:

﴿لَيَجْزِيَنَّ اللّٰهُ الضِّدِّقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبُ الْمُنْفِقِيْنَ اِنْ شَاءَ اَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۝۲۴﴾ (آیت ۲۴)

”تا کہ اللہ سچ بولنے والوں کو ان کے سچ کا بدلہ عطا فرمائے اور منافقوں کو چاہے تو عذاب دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول فرمائے۔“

سوال یہ ہے کہ دونوں آیات کے مضمون میں یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن دونوں کا آخری حصہ مختلف کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے (واللہ اعلم) کہ اس اختلاف میں دونوں آیات کے مابقی کا خیال رکھا گیا ہے۔ پہلی آیت سے قبل ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَلَا تُطِيعِ الْكُفْرِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ ۝۱﴾ (آیت ۱) ”اور کافروں اور منافقوں کی باتوں میں نہ آجانا۔“ پھر منافقین کی حرکتوں کے بارے میں کوئی تفصیلی تذکرہ نہیں کیا گیا، اس لیے مناسب تھا کہ اس کے بعد صرف کفار کا ذکر ہوتا ﴿وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۸﴾ اور یہ بات معلوم ہے کہ منافق بھی ویسے ہی کافر ہے جیسے وہ کافر جو اپنے کفر کا اظہار کرے۔

جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے تو اس سے قبل آیت ۱۲ سے منافقوں کا ذکر شروع ہوتا ہے، فرمایا:

﴿وَاَذِيقُوْهُمُ الْمُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲﴾

”اور جب منافقوں نے اور جن لوگوں کے دلوں میں روگ تھا، کہا: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سراسر دھوکہ تھا۔“

پھر اگلی آیت میں ان کی بد فعلیوں اور برائیوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسُوَّةٌ حَسَنَةٌ﴾ (آیت ۲۱)

”بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) میں ایک اچھا نمونہ ہے۔“

اس کے فوراً بعد اہل ایمان کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی سچا اور پکا مؤمن ہو تو اس کے اوصافِ حسنہ کا کیا عالم ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ ۖ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝۳۷﴾

”اور جب اہل ایمان نے (کفار کے) لشکروں کو دیکھا تو وہ بول اٹھے: یہ تو وہی ہیں کہ جس کا وعدہ اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) نے کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے بالکل سچ کہا تھا۔ اور اس چیز نے ان کے ایمان اور جذبہ فرماں برداری کو اور بڑھا دیا۔“

اس سے اگلی آیت میں ان کی مزید توصیف بیان کی اور اس کے بعد فریقین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿لَيَجْزِيَّ اللَّهُ الضَّالِّينَ بِصُدُوقِهِمْ وَيُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ إِنِ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۖ﴾ (آیت ۲۴)

تو یہاں سچ بولنے والوں کی جزا کا بھی بیان ہو گیا اور منافقین کا بھی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی بردباری، صفتِ معافی اور رحمت کے تقاضے سے جہاں انہیں عذاب دیے جانے کا تذکرہ کیا وہاں اتنی گنجائش اور رکھی کہ اگر وہ چاہے تو ان کی توبہ بھی قبول فرما لے۔

اب ملاحظہ ہو کہ ہر دو طرح کے منکرین (کفار اور منافقین) کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا وہ اپنی اپنی جگہ پوری مناسبت رکھتا ہے۔ یہاں یہ بھی ملاحظہ ہو کہ کتابِ الہی میں اس طرح کا تقابل (مؤمنین اور کفار کا) بارہا کیا گیا ہے۔

(۲۹۶) آیت ۳۸

﴿سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۖ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْفُورًا ۝۳۸﴾

”یہ اللہ کا دستور ہے جو ان لوگوں کے ساتھ بھی ہوا جو پہلے گزر چکے تھے، اور اللہ کا حکم ایک مقررہ اندازہ ہے۔“

اور سورت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝۳۹﴾

”یہ اللہ کی سنت ہے جو ان لوگوں کے ساتھ بھی ہوتی رہی جو پہلے گزر چکے ہیں، اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

آیت کا پہلا حصہ ہر دو جگہ ایک ہی ہے لیکن آخری حصے میں اختلاف ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے (واللہ اعلم) کہ پہلی آیت سے قبل حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے قصے کی طرف اشارہ ہے، جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہوا، پھر نوبت طلاق تک پہنچی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح ہو گیا۔ اس آیت سے اس بات کو واضح کیا گیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی چیز تقدیر میں لکھی گئی ہے تو وہ پوری ہو کر رہے گی، یہی اللہ کی سنت ہے جو پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے۔ یہی انبیاء و رسل علیہم السلام کی سنت رہی

ہے اور جوان کی پیروی کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ گویا اللہ کے رسول ﷺ کو یہ پیغام دیا جا رہا ہے: اے محمد ﷺ! منافقوں کی ان یا وہ گونیوں پر کان نہ دھریں جو یہ کہتے ہیں: دیکھو! محمد (ﷺ) نے اپنے بیٹے کی منکوحہ سے شادی کر لی! اور وہ اس لیے کہ زید ان کا بیٹا کبھی نہ تھا۔ فرمایا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ جَلِئِكُمْ﴾ (آیت ۴۰)

”محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔“

یہ تو میری مشیت تھی کہ زید اُسے طلاق دے گا اور اس کے جدا ہونے کے بعد میں آپ کا نکاح زینب سے کر دوں گا۔ اس بارے میں ارشاد ہوا:

﴿فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْنٌ مِّنْهَا وَطَرًا وَجَنَکَهَا﴾ (آیت ۳۷)

”اور پھر جب زید نے اُس (زینب) سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اسے آپ کے نکاح میں دے دیا۔“

تاکہ سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سنت نہ صرف آپ کے لیے ہے بلکہ آپ کے بعد آپ کی اُمت کے لیے بھی ہے۔ اور سب پر یہ بات واضح ہو جائے کہ لے پالک بیٹا اصل میں صلیبی اولاد نہیں ہوتا، تو کوئی حرج نہیں کہ اگر اس نے اپنی بیوی کو اپنی حاجت پوری کرنے کے بعد طلاق دے دی تو تم اسی عورت سے شادی کر لو!

ان آیات میں اللہ کے رسول ﷺ کو تسلی دی گئی ہے، ہمت بندھائی گئی ہے، آپ کے منصب عالی کی شان بیان کی گئی ہے، منافقین کی باتوں پر دھیان نہ دینے کی بات کی گئی ہے۔ وہ آپ کی شان میں کمی کرنا چاہتے ہیں تو اس بات کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کی شان ان الزامات سے کہیں بلند و بالا ہے اور ایسا نہیں ہے جیسے لوگوں نے اس آیت کے ظاہر سے سمجھا ہے:

﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي

نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ط﴾ (آیت ۳۷)

”اور جب آپ نے اس شخص (زید) سے کہا جس پر اللہ نے انعام کیا تھا اور جس پر آپ نے بھی انعام کیا تھا کہ اپنی بیوی (زینب) کو روک کر رکھ، اور اللہ سے ڈر، اور آپ اپنے (دل) میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں (کی طعنہ زنی) کا خوف رکھتے تھے اور اللہ اس بات کا زیادہ حق دار تھا کہ آپ اُس سے ڈریں۔“

اب مریض دل کے لوگوں نے اس سے وہ مطلب لیا جو ظاہری طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے زینب کو دیکھا تو اس پر تبجھ گئے اور اس سے محبت کرنے لگے، لیکن اس بات کو جسے کچھ مفسرین نے لکھا ہے، اس یقینی دلیل سے رد کیا جاسکتا ہے کہ زینب تو آپ ﷺ کے سامنے پروان چڑھی ہیں اور قرابت داری کی بنا پر آپ انہیں دیکھتے رہے ہوں گے۔ آپ نے زیدؓ سے کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے پروانہ آزادی تھا کر انعام کیا تھا، یہ کہا کہ زینبؓ کے بارے میں باتیں بنانے سے اللہ کا خوف کر، کیونکہ زیدؓ نے زینبؓ کے بارے میں یہ شکایت کی تھی کہ وہ زید کی نافرمانی کرتی ہیں، تو یہ کہنے کا مقصد تھا کہ ان کے بارے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو!

ہوسکتا ہے جسے وہ نشوز (خاوند کی نافرمانی) سمجھتے ہوں اس کی حقیقت کچھ اور ہو۔ زینب تو ایک عالی قدر خاتون تھیں ان سے اس قسم کی بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ جان بوجھ کر اپنے خاوند کی نافرمانی کریں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میاں بیوی باہمی الفت و محبت کی بنا پر ایک دوسرے سے انتہائی وفاداری کی امید کرتے ہوں اور اگر اس میں کوئی کمی آجائے تو اسے نشوز کا ہم پلہ سمجھ بیٹھیں۔ اسی ضمن میں اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے کہہ دیا: **إِنَّ اللَّهَ** اور اسی بات کو چھپایا کہ جسے آپ وحی کے ذریعے پہلے سے جان چکے تھے کہ ایک دن آئے گا جب زید ان کو طلاق دے دے گا اور پھر آپ ان سے نکاح کریں گے۔ یہ وہ بات تھی جو آپ نے چھپائی تھی اور جسے اللہ نے ظاہر کرنا تھا۔ پھر کہا: **وَتَخْشَى النَّاسَ** ”اور آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں“ یعنی آپ منافقین کی یا وہ گویوں سے ڈرتے ہیں، وہ کہیں گے دیکھا محمد (ﷺ) اپنی بہو سے شادی کر بیٹھا ہے (اور وہ اس لیے کہ کہ انہوں نے زید کو اپنا بیٹا قرار دیا تھا اور یہ بات وحی آنے سے پہلے کی ہے)۔ لوگوں میں تو یہ مشہور تھا کہ زید محمد (ﷺ) کا بیٹا ہے، یہاں تک کہ یہ آیت اُتری: **﴿أُدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ﴾** (آیت ۵) ”انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو!“

نبی ﷺ لوگوں کی ان قیاس آرائیوں سے ڈرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی دی گئی کہ آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ آپ تو ہر کام اس شریعت کے مطابق کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے بحیثیت دین پسند کی ہے۔ اور یہی وطیرہ رہا ہے آپ سے پہلے تمام رسولوں کا جو اپنے رب کے احکامات بیان کرتے رہے وہ صرف اللہ سے ڈرتے تھے اور سوائے اللہ کے کسی اور سے نہیں ڈرتے تھے، اور یہی بات اے محمد (ﷺ)! آپ کو بھی زیب دیتی ہے کہ آپ کسی کی بات پر دھیان نہ دیں، صرف اللہ سے ڈریں، کیونکہ آپ ہی سیدھے راستے پر ہیں۔

پھر کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جیسا اللہ نے وعدہ کیا تھا، وہی کر دکھایا۔ اب ملاحظہ ہو کہ اس آیت میں ارشاد ہوا:

**﴿فَلَمَّا قُضِيَ زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا﴾** (آیت ۳۷)

”اور جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اسے آپ کے نکاح میں دے دیا۔“

زینب رضی اللہ عنہا تو نبی ﷺ کی دوسری بیویوں کو مخاطب کر کے فخر یہ انداز میں کہا کرتی تھیں:

**زَوَّجَكُنَّ أَهْلَ الْيَكْنُ وَزَوَّجَنِي اللَّهُ مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمَاوَاتٍ** (صحیح البخاری)

”تمہاری شادی تو تمہارے گھر والوں نے کرائی تھیں اور میری شادی اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے

اوپر سے کروائی۔“

تو یہ بات تھی جسے نبی اکرم ﷺ نے چھپانا چاہا تھا اور جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی مفسرین نے بیان کیا ہے وہ حقیقت سے دور ہے۔ مفسرین ایک کے بعد دوسرے اس بات کو نقل کرتے چلے آئے، حالانکہ وہ باتیں نقل کرنے کے قابل نہ تھیں جب کہ وہ صریحاً قرآن کے خلاف ہیں۔ اللہ رب العزت جسے قرآن سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے تو وہ ان باتوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اب جب یہی اس آیت کا مقصود ہے تو آخر میں بجا طور پر ارشاد فرمایا:

﴿وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا ۝۳۸﴾

”اور اللہ کے کام اندازے کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔“

اس آیت کے بعد بیان فرمایا کہ یہ تو وہ احکام ہیں کہ جن کے بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیجا ہے اور ان کی اس صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

﴿الَّذِينَ يُمِلُّغُونَ رِسَالَتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ۝﴾ (آیت ۳۹)

”یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے پیغامات کو (لوگوں تک) پہنچاتے ہیں، اور وہ اللہ سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی اور سے نہیں ڈرتے۔“

ان اختتامی کلمات کو پورے تدبیر کے ساتھ مطالعہ فرمائیں اور دیکھیں کہ یہ مضمون کئی دوسری آیات میں بھی بیان ہوا ہے:

﴿سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا﴾ (الاسراء: ۷۷)

”یہ سنت ہے ان تمام رسولوں کی جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا۔“

اور آپ کو ہدایت دی گئی:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدْهُمْ اِقْتِبَادَ ۝﴾ (الانعام: ۹۰)

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے تو ان کی اس ہدایت کی پیروی کیجیے۔“

اور اللہ تعالیٰ نے پھر ہمیں بتایا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کر دکھایا تھا:

﴿وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾ (المؤمنون)

”اور بے شک آپ انہیں سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں۔“

اب رہی دوسری آیت تو اس سے قبل ایک اور سنت الہی کا بیان ہوا تھا:

﴿لَٰكِن لَّمْ يَنْتَهُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ

ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

”اگر یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، اور وہ لوگ جو مدینہ میں انواہیں پھیلا رہے ہیں، باز

نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف بھڑکا دیں گے، پھر وہ آپ کے پڑوسی بن کر اس (شہر) میں نہیں رہ سکیں گے

مگر تھوڑا عرصہ۔“

﴿مَلْعُونِينَ ۖ أَيَّمَا تَقَفُّوا أُخِذُوا وَقُتِلُوا تَقْتِيلًا ۝﴾

”ان پر پھٹکار ہو، جہاں بھی یہ لوگ پائے جائیں تو وہ پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کیے

جائیں گے۔“

پھر یہ بتایا گیا کہ یہ تو ایسے لوگوں کے بارے میں سنت الہی رہی ہے:

﴿سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝﴾

”یہی اللہ کا دستور رہا ہے ان لوگوں میں جو پہلے گزر چکے ہیں اور تم اللہ کی اس سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

یہ بات اللہ کی کتاب میں کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ یوں واضح ہو گیا کہ ہر دو آیات کے اختتامی کلمات اپنی اپنی جگہ بالکل مناسبت رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم!

## سورۃ سبا

(۲۹۷) آیت ۹

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝۹﴾

”بے شک اس میں نشانی ہے ہر اُس بندے کے لیے جو جھکنے والا ہے۔“

اور پھر آیت ۱۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝۱۹﴾

”بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو انتہائی صابر اور شکر گزار ہے۔“

سوال یہ ہے کہ پہلی آیت میں (آیۃ: ایک نشانی) کہا گیا اور دوسری آیت میں (آیۃ: نشانیاں) جمع کے صیغے کے ساتھ بیان ہوا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت کی ابتدا میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا وہ صرف ایک چیز تھی:

﴿أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۖ إِنَّ نَاشِئًا مُّخْسِفٌ بِهِمُ

الْأَرْضِ أَوْ نَسْفِطُ عَلَيْهِمْ كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ ۖ﴾

”کیا وہ اپنے آگے پیچھے زمین و آسمان کو نہیں دیکھتے؟ اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا ان کے

اوپر آسمان کے ٹکڑے برسا دیں!“

ملاحظہ ہو کہ یہاں عبرت پکڑنے کے لیے صرف ایک چیز کا ذکر ہوا ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ آغاز میں ”مما“

بطور اسم موصول لایا گیا کہ جو خود مفرد ہے اور اس کے مفرد ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے (آیۃ) مفرد لایا گیا۔

جہاں تک آیت ۱۹ کا تعلق ہے تو اس سے قبل ایک نہیں، کئی نشانیاں ذکر کی گئیں۔ پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کا

تذکرہ ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ لِيُجِبَالَ آوِيْنَ مَعَهُ وَالظَّالِمِينَ ۖ وَاللَّهُ لَهُ الْحُدُودُ ۝۱۰﴾

”اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے فضل عطا کیا۔ اے پہاڑو! تم اس کے ساتھ تسبیح بیان کرو اور اے پرندو!

(تم بھی)۔ اور ہم نے اُس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔“

پھر حضرت سلیمان علیہ السلام پر اپنی نعمتوں کا تفصیلی ذکر کیا:

﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحُ غَدُوهَا شَهْرٌ وَرَوَّاحُهَا شَهْرٌ ۖ وَأَسْلَمْنَا لَهُ الْفِطْرَ ۖ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ

بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ﴾ (آیت ۱۲)

”اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا، اس کی صبح کی منزل بھی ایک ماہ کی ہوتی تھی اور شام کی منزل بھی ایک ماہ کی۔ اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا۔ اور جنّات میں سے بھی کچھ اللہ کے اذن سے اس کے سامنے کام کرتے تھے۔“

پھر ان کے چند مزید اوصاف بتائے:

﴿يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُونَ مِنْ فَخَارٍ ذَلِيلٍ وَجَنَّاتٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَتٍ﴾ (آیت ۱۳)  
 ”اور جو کچھ وہ چاہتے یہ جنّات ان کے لیے بنا دیتے، جیسے قلعے اور مورتیاں، تالابوں کے برابر لگن اور چولہوں پر ایستادہ دیگیں۔“

اور پھر جنّات کی حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے لاعلمی کی بنا پر کام میں جتے رہنے کا تذکرہ کیا گیا، اور آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوا:

﴿أَن لَّهُمْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ﴾ (۱۴)

”(انہیں یہ معلوم ہوا) کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس رسوا کن عذاب میں لگے نہ رہتے۔“

اس کے بعد قوم سبا پر احسانات کا تذکرہ ہوا:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِهُمْ آيَةٌ جَنَّتْنِي عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ﴾ (آیت ۱۵)

”یقیناً قوم سبا کے لیے اپنی بستیوں میں ایک نشانی تھی، دائیں بائیں دو باغات تھے۔“

اب ملاحظہ ہو کہ یہاں کتنی نشانیاں بیان ہوئی ہیں:

- حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح بیان کرنا۔
- لوہے کو ان کے لیے نرم بنایا جانا۔
- حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کیا جانا کہ وہ انہیں اور ان کے لشکریوں کو کس سرعت کے ساتھ جہاں وہ چاہتے لے جاتی۔
- تانبے کے چشمے جاری کر دیے گئے۔
- جنّات کو ان کے تابع کر دیا اور وہ جو چاہتے ان سے بنوا لیتے۔
- پھر قوم سبا پر جو نعمتیں بصورت باغات نازل کی گئی تھیں، ان کا تذکرہ ہوا۔
- بالآخر ان کی بدعہدی کی بنا پر اس عذاب کا ذکر ہوا جو ان پر نازل کیا گیا تھا، یعنی بند توڑ کر سیلاب کا پانی اُن کو بہا لے گیا۔

یہ ساری نشانیاں کسی ایک اسم موصول کے بعد بیان نہیں ہوئیں، بلکہ علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئیں

تو ان کی طرف ”آیت“ صیغہ جمع کے ساتھ لاکر اشارہ کر دیا گیا (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ)

یہاں ملاحظہ ہو کہ اس آیت سے پہلے کوئی ایسا اسم موصول بیان نہیں ہوا جو یا تو خود مفرد ہو یا اپنے اندر جماعت کا مفہوم رکھتا ہو اور پھر اس کا لحاظ رکھتے ہوئے بجائے ”آیت“ کے مفرد صیغے کے ساتھ ”آیۃ“ کا لفظ لایا



جاتا، برخلاف پہلی آیت کے جس کے قبل اسم موصول ”مَہَا“ لایا گیا تھا۔ یہاں عربی زبان کے اس قاعدے کا بھی خیال رکھا جائے کہ اگر عبارت میں کوئی اسم موصول لایا جائے جو یا تو خود ہی مفرد ہو یا اپنے دامن میں مفرد، ثنی یا جمع کے معانی بھی رکھتا ہو تو بعد میں جو عبارت آئے گی اس میں اگر لفظ کا اعتبار ہوگا تو اس کی مناسبت سے مفرد کلمہ لایا جائے گا، اور اگر معنی کا اعتبار ہو تو مفرد، ثنی یا جمع کے کلمات لائے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(الطلاق: ۱۱)

”اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرے تو وہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

شروع میں ”مَنْ“ اسم موصول لایا گیا جو مفرد ہے لیکن اس کے اندر جمع کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، تو شروع کے دو افعال ”يُؤْمِنْ“ اور ”يَعْمَلُ“ مفرد ہیں۔ اسی طرح ”يُدْخِلْهُ“ میں ”كَا“ کی ضمیر بھی مفرد ہے جو ”مَنْ“ ہی کی طرف لوٹی ہے، لیکن اس کے بعد اگلے لفظ ”خَالِدِينَ“ میں جو کہ جمع ہے ”مَنْ“ میں پنہاں جماعت کے مفہوم کا اعتبار کر لیا گیا۔

ایک شعر بھی ملاحظہ ہو جس میں ”مَنْ“ کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے:

تَعَالِ فَإِنْ عَاهَدْتَنِي لَا تَخُونَنِي  
نَكُنْ مِثْلَ مَنْ يَا ذَنْبُ يَصْطَحِبَانِ  
(صيد الفوائد، فرزدق)

”آجا اگر تو نے مجھ سے یہ عہد کر لیا کہ تو مجھ سے خیانت نہیں کرے گا تو ہم دونوں اے بھیڑیے! ایک دوسرے کے مصاحب بن جائیں گے۔“

یہاں ”مَنْ“ کے بعد ”يَصْطَحِبَانِ“ تثنیہ کا صیغہ لایا گیا جس میں ”مَنْ“ کے معانی کا اعتبار کیا گیا (یعنی ”مَنْ“ مفرد، تثنیہ اور جمع تینوں مفاہیم کے لیے لایا جاسکتا ہے)۔ بہر صورت زیادہ تر لفظ ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے، معنی کا اعتبار بہت کم کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ پھر ہم اس بات کی وضاحت کر دیں کہ دوسری آیت جہاں (لَا يَتَّخِذُ) بصیغہ جمع بیان ہوا تھا، اس سے قبل بہت سارے انعامات کا تذکرہ کیا گیا تھا اور ان تمام آیات سے قبل کوئی اسم موصول نہیں لایا گیا کہ جو خود مفرد ہو یا اپنے معانی میں متعدد مفاہیم رکھتا ہو اور پھر اس کے لحاظ سے بعد میں جو عبارت لائی جائے وہ مفرد بھی لائی جاسکتی ہے یا جمع بھی لائی جاسکتی ہے۔

یہاں ایک اور اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے کہ یقیناً یہاں بہت سی نعمتوں کا بیان ہوا کہ جن سب کی طرف آخر میں ”لَا يَتَّخِذُ“ کہہ کر اشارہ کیا گیا۔ جب کہ یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ شروع میں داؤد اور سلیمان علیہ السلام کے اوپر انعامات کا تذکرہ ہوا لیکن پھر اس آیت سے ایک الگ مضمون شروع ہو گیا۔ یعنی قوم سبا کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ

کیا گیا: ﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِهُمْ آيَةٌ﴾ ”لَقَدْ“ میں جو لام ہے اسے لام قسم کہا جاتا ہے اور جب عبارت ”لَقَدْ“ سے شروع ہو تو گویا وہ ایک نئی تمہید ہے جس کا پچھلے مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، تو یہاں اب صرف ایک ہی نشانی باقی رہ گئی جو کہ قوم سبا سے متعلق تھی تو اس لحاظ سے آخر میں ”لَايَةُ“ بصیغہ مفرد کا لانا کیا مناسب نہ ہوتا؟

اس کے جواب میں ہم دو باتیں کہیں گے۔ پہلی تو یہ کہ اگر آپ کی بات مان ہی لی جائے تب بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ قوم سبا کے قصے میں بھی بہت ساری تفصیلات ہیں اس لیے ”لَايَةُ“ بصیغہ جمع کا لایا جانا بالکل مناسب تھا۔ دوسری بات یہ کہ جو آپ نے اعتراض کیا ہے وہ کوئی لازمی چیز نہیں ہے اس لیے کہ جہاں ”لَقَدْ“ لایا جاتا ہے ضروری نہیں کہ وہاں سے ایک نئی بات ہی شروع ہو۔ نہیں! بلکہ اس کا تعلق پچھلی عبارتوں سے قائم رہتا ہے۔ جیسے سورۃ القمر میں کئی انبیاء و رسل علیہم السلام کے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا، جن میں نوح، ہود، صالح، لوط علیہم السلام اور قوم فرعون کا تذکرہ ہے اس کے بعد کہا گیا:

﴿أَكْفَارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَئِكَ﴾ (القمر: ۲۳)

”کیا تمہارے کافران لوگوں سے بہتر ہیں؟“

اب دیکھئے کہ پچھلے تمام قصص سے قبل ”لَقَدْ“ کا لفظ مذکور تھا، لیکن اس کے باوجود ”أُولَئِكَ“ کے لفظ سے تمام اقوام سابقہ کے کفار کی طرف اشارہ ہو گیا۔ یہ نہیں ہوا کہ چونکہ ہر قصہ ”لَقَدْ“ کے لفظ سے شروع ہوتا ہے تو اس کا تعلق پچھلے قصے سے منقطع ہو گیا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو پھر ”أُولَئِكَ“ میں ان سب اقوام کی طرف اشارہ کیوں کیا جاتا؟

امید ہے اس تفصیل سے ہمارا مدعا ثابت ہو گیا ہوگا کہ ”آیت“ بصیغہ جمع کا لایا جانا بالکل مناسب تھا، واللہ اعلم!

## سورۃ فاطر (الملائکۃ)

سورۃ فاطر اور سورۃ یسین پر پہلے بات ہو چکی ہے۔

## سورۃ الصفّت

(۲۹۸) آیات ۱۵-۱۶

﴿وَقَالُوا إِن هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ (۱۵) إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۱۶﴾

”اور انہوں نے کہا: یہ تو بس کھلا کھلا جادو ہے۔ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں میں رل مل

جائیں گے تو کیا ہم (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے؟“

اور پھر آیات ۵۱ تا ۵۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ يَقُولُ إِنَّكَ لَإِن الْمُسْدِقِينَ ۝ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءِإِنَّا لَمَدِينُونَ ۝﴾

”ان میں سے ایک نے کہا: میرا ایک ساتھی ہوا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ کیا تم اس بات کو مانتے ہو کہ جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو ہمارا حساب کتاب لیا جائے گا؟“

ان دونوں آیات کا مرکزی مضمون قیامت کے دن اٹھائے جانے کا انکار ہے، لیکن دونوں آیات کے آخری الفاظ مختلف ہیں، ایک میں ”ءِإِنَّا لَمَدِينُونَ“ اور دوسری میں ”ءِإِنَّا لَمَدِينُونَ“ کہا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت سے قبل کوئی ایسا تذکرہ نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے اس عقیدے سے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا نہیں ہے، پھر گئے ہوں، اس لیے آیت میں ان کے اس عقیدے کا ہی ذکر کیا گیا۔ لیکن دوسری آیت سے قبل اخروی جزا کا سوال و جواب کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات کا ذکر آیا کہ اٹھائے جانے کے فوراً بعد کہا جائے گا:

﴿وَقِفُّهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ ۝﴾

”اور انہیں ٹھہراؤ، ان سے پوچھا جائے گا۔“

پھر فرمایا:

﴿وَمَا تُحْجَرُونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝﴾

”اور تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا، مگر ان سب اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے۔“

پھر ارشاد فرمایا:

﴿فَأَقْبِلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝﴾

”پھر ان میں سے کچھ لوگ دوسروں سے سوال کرنے لگے۔“

اور پھر آیت ۵۱ میں مندرجہ بالا ساتھی کا تذکرہ ہے۔ بات کرنے والا ایک کافر ہے، یوم محشر ہے، اب جو عذاب کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے قرین (ساتھی) کی بات یاد آتی ہے۔ یہ قرین وہی ہے جس کا تذکرہ سورۃ الزخرف میں بیان ہوا:

﴿وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۝﴾

”اور جو شخص رحمن کے ذکر سے آنکھیں موند لیتا ہے، ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔“

اور پھر وہ اس بات کو دہراتا ہے جو اس نے دنیا میں اس سے کہی تھی کہ کیا جب ہم مرجائیں گے، مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو کیا ہمارا حساب کتاب ہوگا؟ اور کیا تم بھی اس بات کو مانتے ہو؟

جب یہ کہا: **إِنَّا لَمَدِينُونَ**: (کیا ہم سے حساب لیا جائے گا؟) اس بات کا انکار بھی شامل ہو گیا کہ کوئی حشر نشر نہیں ہوگا۔ اس سے قبل جزا کا ذکر آچکا تھا تو ان کے حساب کیے جانے پر تعجب کا اظہار بھی مناسب تھا۔ اس اعتبار سے پہلی آیت کے آخر میں **”إِنَّا لَمَدِينُونَ“** کہنے کا موقع نہ تھا کہ وہاں صرف دوبارہ اٹھائے جانے کے عقیدے کا اظہار کرنا ہی مناسب تھا اور اس لحاظ سے ہر دو آیات کا آخری فقرہ اپنی اپنی جگہ پوری مناسبت رکھتا ہے واللہ اعلم!

(۲۹۹) آیت ۸۰

﴿إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۸۰﴾

”بے شک ہم ایسے ہی اچھائی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔“  
یہ آیت حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کے بعد کہی گئی ہے اور پھر یہی آیات حضرات ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ اور ہارون علیہ السلام اور الیاس علیہ السلام کے قصص کے بعد بیان ہوئی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں یہ آیت دو دفعہ آئی ہے اور دوسری دفعہ اس آیت کے آغاز میں **”إِنَّا“** کا تاکید لفظ نہیں لایا گیا۔ فرمایا:  
﴿سَلِّمْ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝۷۹ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۸۰﴾  
”سلامتی ہو ابراہیم پر۔ ہم ایسے ہی نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔“  
تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے واللہ اعلم! کہ ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں پہلے یہ آیت **”إِنَّا“** کے ساتھ آچکی ہے فرمایا:  
﴿وَنَادَيْنَاهُ أَنِ يَا إِبْرَاهِيمُ ۝۷۹ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۸۰﴾  
”اور ہم نے اسے پکارا: اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا، بے شک ہم ایسے ہی نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔“  
پھر اس آیت کی تکرار کی گئی تاکہ اس کے بعد ﴿إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝۸۱﴾ پر آیت کا اختتام ہو جیسے ان تمام دوسری آیات میں یہ اختتامیہ آیت لائی گئی تھی کہ جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ اس جزاء حسن کا سبب کیا تھا اور وہ یہ کہ ”وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔“

یہ ایسے ہی ہے جیسے سورۃ المؤمنین میں **”أَنكُمُ“** کی تکرار ہے۔ فرمایا:

﴿أَيَعِدْكُمْ أَنكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَكُمْ فَتُحْيَوْنَ ۝۷۹﴾

”کیا وہ تمہیں اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے، مٹی اور ہڈی بن جاؤ گے تو (دوبارہ) نکالے جاؤ گے؟“

یہاں **”أَنكُمُ“** شروع میں آچکا تھا لیکن بعد میں دوبارہ لایا گیا تاکہ اس کے بعد جملے کی خبر آ سکے۔ اسی طرح سورۃ الصافات میں پورے کے پورے جملے کا اعادہ کیا گیا تاکہ یہ یقین دہانی کرائی جاسکے کہ محسنین کے بدلے کی علت کیا ہے اور جیسے باقی قصص میں یہ آیت بیان ہوئی ہے تو قصہ ابراہیم میں بھی اس کا تذکرہ ہو۔ صرف اتنا کیا گیا کہ

حرفِ تاکید (اِنَّا) کو بغرض اختصار حذف کر دیا گیا کہ یہ حرف پہلے آچکا تھا۔ اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت میں اور اس کے مماثل دوسری آیات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب پہلے ﴿اِنَّا كَذَلِكْ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ کہا گیا تھا تو وہیں ﴿مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ﴾ بھی کہہ دیا جاتا تو ﴿كَذَلِكْ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی؟  
اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت شان اور بزرگی کے اظہار کے لیے متعدد آیات لائی گئیں۔ بیٹے کی قربانی کا قصہ بیان ہوا تو ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝۵﴾

”بے شک یہ ایک کھلا کھلا امتحان تھا۔“

اور اس میں جو عبرت کا پہلو ہے اسے اجاگر کرنے کے لیے فرمایا:

﴿وَقَدْ يَنْهٰهُ بِذُنْحٍ عَظِيْمٍ ۝۶ وَتَوَكَّدْنَا عَلَیْهِ فِي الْاٰخِرِیْنَ ۝۷ سَلَّمَ عَلٰی اٰبَرٰهِيْمَ ۝۸﴾

”اور ہم نے ایک عظیم الشان ذبح کی شکل میں ان کا فدیہ ادا کر دیا۔ اور بعد میں آنے والے لوگوں میں ان کا ذکر باقی رکھ دیا۔ تو سلامتی ہو ابراہیم پر۔“

ان چند جملوں کے آجانے سے کلام میں طوالت پیدا ہوئی، ﴿اِنَّا كَذَلِكْ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ والی آیت سے بھی ایک فاصلہ پیدا ہوا تو مناسب ہوا کہ اس جملے یعنی ﴿كَذَلِكْ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ کا اعادہ کیا جائے تاکہ اس کے بعد ﴿اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ﴾ والا جملہ لایا جاسکے جس میں نیکی کے بدلے کی وجہ بتائی گئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ باقی تمام قصص کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں سیرتِ ابراہیمی کا اوج کمال بھی ہے، جزاءِ محسنین کا بالکل ارباب بیان بھی ہے اور ان کے امتحان کی شدت کا بھرپور اظہار بھی ہے۔ اس لیے مذکورہ آیت کا اعادہ انتہائی مناسب تھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں کہ ان کا قصد کیا تھا! ❀

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت عام: 75 روپے

اشاعت خاص: 200 روپے

# تعلیم کے اولین اصول<sup>(۴)</sup>

## First Principles of Education

از: ڈاکٹر محمد رفیع الدین

مترجم: پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان

### باب دوم

## تعلیمی نشوونما کا فطری تقاضا

اگر تعلیم سے مراد انسان میں کوئی فائدہ مند تبدیلی لانا ہے تو اس کا مطلب سوائے نشوونما کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نشوونما ہی وہ خوش گوار تبدیلی ہے جس کا زندگی سے قریبی تعلق ہے۔ دراصل ہمیں لفظ نشوونما سے ایک مکمل طور پر منظم اور سائنٹفک نظریہ تعلیم کا سراغ ملتا ہے جس سے اس کے مقاصد اور طریقہ ہائے کار دونوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جدید مفکرین تعلیم چاہے فطرت پرست ہوں، افادیت پرست ہوں یا صورت پرست پسند اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ تعلیم قدرتی طور پر ترقی و نشوونما پانے کا ایک ایسا عمل ہے جو سازگار حالات میں خود بخود وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ تعلیم کے افادیت پرست مفکرین سے جو انسانی مفادات پر تعلیم کے عملی اثرات سے تعلیمی سرگرمی کو جانچنے کے قائل ہیں، بہت کم توقع تھی کہ وہ تعلیم کے تصور کو نشوونما کے ساتھ منسوب کریں۔ تاہم اس نقطہ نظر کی معقولیت اس قدر واضح اور پُر اثر ہے کہ ان (افادیت پرست مفکرین) میں سے سب سے زیادہ نمایاں مفکر ڈیوی وقی طور پر یہ بھول کر کہ اس کے مضمرات اس کے افادیت پسند نظریہ تعلیم کے خلاف جائیں گے اس کی حمایت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ لکھتا ہے:

”یوں تعلیم نشوونما دینے، پروان چڑھانے نیز سنوارنے اور نکھارنے کا عمل ہے۔ ان سب الفاظ کا مطلب یہ

ہے کہ تعلیم کی توجہ نشوونما کے حالات پیدا کرنے پر ہوتی ہے۔“

”جو تعلق غذا اور افزائش نسل کا جسمانی زندگی سے ہے وہی تعلیم کا سماجی زندگی سے ہے۔“

”چنانچہ تعلیم کا مطلب ایسے حالات مہیا کرنا ہے جو نشوونما کو یقینی بنائیں۔“

وہ دن گئے کہ جب تعلیم کا مطلب انسانی ذہن میں معلومات کو ٹھونس ٹھونس کر بھرنا سمجھا جاتا تھا۔ لیسٹر سمتھ (Lester Smith) اپنی کتاب ”Education“ میں لکھتا ہے:

”حال ہی میں کوئی بیس سال قبل مسٹر ایڈلس بکسلے کو اس بات پر پُر زور احتجاج کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس نے کہا کہ ذہن کوئی خالی برتن نہیں ہے کہ جسے میکا کی انداز میں بھرا جاسکتا ہے۔ یہ زندہ (عضویہ) ہے جسے لازمی طور پر غذا چاہیے۔ عضویہ غذا اسی صورت جذب کرتا ہے جب اسے پوری رغبت کے ساتھ کھایا جائے۔“

مسٹر بکسلے کے چھپتے ہوئے الفاظ کی مثبت اور تعمیری اہمیت تھی کیوں کہ انہوں نے ان دیواروں کو ڈھانے میں مدد دی جو ابھی بھی بچوں سے متعلق نئے علم کے فروغ کی راہ میں سختی سے حائل تھیں۔ تاہم آج یہ باتیں صرف آثارِ قدیمہ کی کسی شے کے طور پر دلچسپی کی حامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ہم سب ماہر حیاتیات بنے بیٹھے ہیں اور کوئی اسکول ایسا نہیں ہے جس میں نشوونما، غذا اور رغبت سے متعلق اس کے بحث کو پسند نہ کیا جاتا ہو اور اس پر عمل نہ کیا جاتا ہو۔

چنانچہ جدید مفکرین تعلیم بجا طور پر اصرار کرتے ہیں کہ عملی معلم کے لیے صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ جو بچے اس کی نگہداشت میں دیے گئے ہیں ان کی تعلیمی نشوونما کے لیے سازگار حالات پیدا کر دے، نشوونما خود بخود ہو جائے گی۔ بد قسمتی سے وہ مفکرین اب تک اپنے نظریات کو کسی ضابطے میں لا کر ان سے استفادہ کرنے اور ان کی تفصیلات طے کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں۔ نیز اس امر کے کئی مضمرات تک رسائی نہیں پاسکے ہیں کہ تعلیم نشوونما کا نام ہے اور اسی ایک وجہ سے موجودہ صورتِ حال میں کوئی ایک فلسفہ تعلیم بھی ایسا نہیں ہے جو منظم اور مربوط ہو، اور جو تعلیم کے تمام حقائق کی ایک فطری انسانی سرگرمی کے طور پر مناسب انداز میں وضاحت کرتا ہو۔ اپنے تعلیمی فلسفوں کی صورت پذیری کرتے ہوئے اب تک اس حقیقت کا صرف وہ پہلو جس پر انہوں نے توجہ دی ہے یہ ہے کہ چونکہ نشوونما ایک فطری عمل ہے چنانچہ تمام فطری اعمال کی طرح اس پہلو کی حمایت کرنا اور اعانت کرنا چاہیے، لیکن اس میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے، ورنہ یہ یقیناً غلط رخ اختیار کر لے گا۔

اس حقیقت سے کہ تعلیم ایک قدرتی نشوونما کا عمل ہے، یہ استخراجِ مکمل طور پر جائز ہے اور حال ہی میں تحلیل نفسی (psycho-analysis) کے نظریات سے اسے مزید تائید اور تقویت حاصل ہوئی ہے۔ اس استخراج کے مطابق قدرتی اور معمول کی انسانی سرگرمیوں میں مداخلت جذباتی جبر اور ذہنی اختلال کا باعث بنتی ہے، اور اس اعتبار سے انتہائی مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید زمانے کا معلم یہ بات یقینی بنانے کے لیے بہت مشوش رہتا ہے کہ باہر سے بچے پر کچھ نہ تھوپا جائے اور یہ کہ اس کی فطری تحریکوں کو چاہے وہ کتنی ہی بے ڈھنگی اور قدیم وضع کی کیوں نہ ہوں، آزادانہ اور مکمل اظہار کی اجازت دی جائے۔ ایسے حالات پیدا کرنے کے بعد کہ جس میں معلم سمجھتا ہے کہ بچہ خود ہی مناسب طور پر تعلیم حاصل کرنے کے عمل سے گزرے گا، وہ خود اس کی تدریجی نشوونما کا جائزہ لینے کے حوالے سے محض ایک تماشائی کا کردار ادا کرنے پر مطمئن ہوتا ہے۔

تاہم یہ بات واضح ہے کہ جیسے ہی ہم یہ کہتے ہیں کہ تعلیم اندر سے قدرتی نشوونما کا ایک عمل ہے تو ہم دو

مفروضے قائم کرتے ہیں چاہے ہم ان مفروضوں کے قائم کرنے سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں۔ وہ (مفروضے) یہ ہیں:

۱: انسان کے اندر کچھ ہے جو اس کی تعلیم کے نتیجے میں نشوونما پاتا ہے۔

۲: انسان کے اندر تعلیمی نشوونما کے لیے ایک قدرتی فطری تقاضا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نشوونما کے اس عمل کو سمجھنے کے لیے جسے تعلیم کے نام سے جانا جاتا ہے ہمارے لیے اس بات کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے کہ ان دو مفروضوں میں سے ہر ایک کا معنی و مفہوم کیا ہے۔

آغاز پہلے مفروضے سے کرتے ہیں۔ نشوونما کے تصور کو نشوونما پانے والی شے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت کہ انسان کے اندر کوئی شے ہے جو تعلیم کے نتیجے میں نشوونما پاتی ہے اس سوال کو جنم دیتی ہے کہ وہ شے کیا ہے!

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اس بات کا احساس کرنا ہوگا کہ گو تمام جانور مادی جسم رکھتے ہیں مگر تعلیم پانے کی صلاحیت اور ضرورت صرف انسان کا خصوصی اعزاز ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض جانوروں کو مخصوص حالات میں اور مخصوص انداز میں عمل کرنے کے لیے سدھایا جاسکتا ہے مگر کسی جانور کو سدھانے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اس کی جبلتوں میں سے کسی ایک کے معمول کے اظہار کو (دوسری جبلتوں کے ساتھ منسلک کر کے یا ان کی سرگرمی کے زیر اثر) اس انداز میں بدل دیا جائے کہ جو سدھانے والے کو اس آتا ہو۔ یہ تبدیلی اس حد کو عبور نہیں کر سکتی جو جبلت کی غایت اور ماہیت نے مقرر کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبلت کی بدلی ہوئی سمت یا تربیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سرگرمی جبلت کے قدرتی حیاتیاتی مقاصد کو سرانجام دیتی رہتی ہے اور جانور کی زندگی کے باقی حصے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ دیگر جبلتوں کے زیر اثر اسی طرح کام کرتے رہتے ہیں۔ چاہے ہم جانوروں کی جبلتوں کی سرگرمی کو ایک رخ پر چلائیں یا دوسرے رخ پر ان میں سوائے مادی بدن کے اور کسی شے کی نشوونما نہیں ہوتی۔ چنانچہ جانور کے تربیتی عمل کو انسان کی تعلیم کے ساتھ گڈ نہیں کیا جاسکتا جو کہ اس کے مادی جسم کی نشوونما کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی شے کی نشوونما ہے جو مادی جسم سے ماوراء ہے اور انسان کے سوا دوسرے جانوروں کے پاس نہیں ہے۔

اگر ہم انسان کی فطرت اور جانور کی فطرت کے مابین فرق سے آگاہ ہیں تو اس شے (something) سے آشنا ہوا جاسکتا ہے۔ تمام ماہرین حیاتیات اس بات پر متفق ہیں کہ حیات کی انسانی شکل حیاتیاتی ارتقاء کی بلند ترین کڑی ہے نیز تمام انواع حیات میں سب سے زیادہ مکمل و اکمل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کبھی انسان سے بلند تر کوئی نوع حیات وجود میں آجائے۔ مزید برآں حیاتیات کے حقائق نے انہیں اس نتیجے پر پہنچنے میں رہنمائی کی کہ انسانی شعور اپنی خوبی میں بے مثل ہے اور یہ کہ انسان اور دیگر جانوروں میں فرق صرف درجہ (حیات) کا نہیں بلکہ نوع کا ہے۔ انسان بلند تر درجے کا جانور نہیں اور نہ ہی جانور کم تر درجے کا انسان۔ انسان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ارتقاء کی خاصیت بدل گئی ہے۔ اب ارتقاء کی نوعیت جسمانی نہیں رہی بلکہ نفسیاتی ہو گئی ہے۔ جولین ہکسلے (Julian Huxley) اس دور کے چوٹی کے ماہرین حیاتیات میں سے ہے۔ وہ لکھتا ہے:



”ارتقائی مرحلے کے انسانی سطح پر پہنچنے کے ساتھ ہی ارتقاء کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ انسانی شعور کے ساتھ پہلی مرتبہ صفحہ ہستی پر اقدار اور نصب العینوں کا ظہور ہوا۔ اب مزید ترقی کا پیمانہ اس امر پر منحصر ہوگا کہ کس حد تک ان مثالی اقدار پر عمل کیا گیا ہے۔“

”کائناتی عمل کا بلند ترین اور عالی شان حاصل ارتقاء یافتہ انسانی شخصیت ہے۔“

”انسانی ارتقاء کا راستہ اتنا ہی بے مثل ہے جتنے کہ اس کے ثمرات۔ یہ بے مثل ان سطحی معنوں میں نہیں ہے کہ کسی بھی دوسرے عضو کے ارتقائی عمل سے مختلف ہے بلکہ اس عمیق تر مفہوم میں بے مثل ہے کہ یہی ایک راستہ تھا جو انسان کے امتیازی وصف کا باعث بن سکتا تھا۔“

”بظاہر یہ کسی بھی دوسرے سلسلہ حیات کے لیے حیاتیاتی لحاظ سے ناممکن الوقوع بات ہے کہ کسی نئی بلند ترین نوع کی جانب پیش قدمی کر لے۔“

وہ کیا جو ہر ہے جو دوسرے جانوروں میں نہیں مگر انسان میں ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اقدار یا نصب العینوں کے ساتھ محبت کرے یا ایک ایسی ارتقاء یافتہ شخصیت حاصل کر لے جو ہیکسلی (Huxley) کے مطابق کائناتی (ارتقائی) عمل کا بلند ترین اور عالی شان حاصل ہے؟ یقیناً یہی جو ہر ہے جو انسان میں تعلیم کے نتیجے میں نشوونما پاتا ہے۔

انسان اور جانور کے مابین بنیادی فرق یہ ہے کہ جانور صرف جانے، محسوس کرنے اور سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے جبکہ انسان جب ایسا کرتا ہے تو وہ یہ جانتا بھی ہے کہ وہ جان سکتا ہے، محسوس کر سکتا ہے اور سوچ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جانور صرف آگاہی رکھتا ہے انسان خود آگاہ بھی ہے۔ یہی حقیقت ہے جو انسان اور جانور کی فطرت میں موجود تمام فرق پیدا کرتی ہے۔ یوں تعلیم کے نتیجے میں انسان کے اندر جس شے کی نشوونما ہوتی ہے وہ اس کی خود شعوری ہے جس کا مطلب ہے اپنے آپ کا شعور اپنے آپ سے آگہی اپنے آپ کا ادراک۔ ظاہر ہے انسان کا اپنے آپ سے ادراک کا مطلب یہ ہوگا کہ اُسے اُن تمام قسم کے سوالوں کے درست جواب سے آگہی ہے جو وہ اُس دنیا کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں پوچھ سکتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر: انسانوں اور موجودات کی اس دنیا کے ساتھ جو میرے ارد گرد ہے، میرا کیا رشتہ ہے؟ اس دنیا کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہونا چاہیے؟ اس دنیا میں کیا ہے جسے میں پسند کرتا ہوں یا جس سے میں محبت کرتا ہوں؟ وہ کیا ہے جسے مجھے پسند کرنا چاہیے یا جس سے مجھے محبت کرنا چاہیے؟ وہ کیا ہے جو حقیقتاً پسند کیے جانے یا محبت کیے جانے کے لائق ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ مجھے کیسے کرنا چاہیے؟ فی الوقت میں کیا کر رہا ہوں؟ میرے پیش نظر میری زندگی کا معنی و مطلب اور مقصد کیا ہے؟ یا کیا پیش نظر ہونا چاہیے؟ یوں دنیا کے حوالے سے اس کا اپنی ذات سے متعلق ادراک دراصل اس کا اپنی ذات کے حوالے سے دنیا کا ادراک ہے۔ نتیجتاً جتنا وہ اس دنیا کے بارے میں زیادہ جاننا شروع کرتا ہے اتنا ہی اُسے اپنے متعلق زیادہ ادراک ہوتا ہے اور وہ زیادہ اس کا اہل ہو جاتا ہے کہ اپنے متعلق ان سوالات کے جواب دے سکے جو اوپر پوچھے گئے ہیں۔

ان سوالات کے جوابات سے متعلق اس کا علم یعنی اس کا اپنے آپ سے متعلق علم بالآخر احساس، شعور اور باطنی تجربے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جیسے جیسے اس کا اپنے متعلق علم بڑھتا ہے، اس کے احساس و شعور اور تجربات بہتر سے بہتر ہوتے جاتے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ ویسا ہی بنتا جاتا ہے جیسا کہ اپنے ارد گرد انسانوں اور موجودات کی دنیا کا اس کے حوالے سے مقام و مرتبہ ہے۔ نیز جب وہ خود اور اپنے ارد گرد انسانوں اور موجودات کی دنیا سے آگاہ ہو جاتا ہے تو دنیا اور اپنی فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے سوچتا ہے کہ: اچھائی اور برائی کیا ہے؟ کون سے کام ہیں جو کرنے چاہئیں اور کن کاموں کو پسند کرنا یا ان سے محبت کرنا چاہیے؟ یوں انسان کی دو حیثیتیں ہیں۔ وہ ایک ذی حیات وجود ہے؛ اس کے علاوہ وہ ایک خود آگاہ ذات یا مختصراً (یوں کہہ لیجیے کہ) ایک ذات (Self) ہے۔ تعلیم کے زیر اثر بالخصوص انسان میں جو شے پیدا ہوتی ہے وہ حیوانی خصائص نہیں بلکہ ذات ہے۔ تعلیمی نشوونما بنیادی طور پر حیاتیاتی (Biological) نہیں بلکہ نفسیاتی (Psychological) ہے اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ایک تعلیم یافتہ انسان اپنی حیاتیاتی نشوونما کی دیکھ بھال ایک غیر تعلیم یافتہ انسان کی نسبت بہتر طور پر کر سکتا ہے۔

یہ کارٹیسین ثنویت (Cartesian Dualism) نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں جانوروں کی نشوونما ذات کی نشوونما کا محض ابتدائی مرحلہ ہے۔ خود کائنات نشوونما کے طویل سفر سے گزری ہے جس کے نتیجے میں اُس انسان میں ذات اپنے کمال کو پہنچی جو حیاتیاتی لحاظ سے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ کامل ہے۔ انسان کے اندر حیوانی پہلو کی حیثیت ایک آلہ کار کی ہے جسے ذات نے اپنی آئندہ نشوونما کے لیے بنایا ہے۔ جب انسان میں ذات اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو یہ آلہ کار سے تغافل نہیں برتی بلکہ اپنی نشوونما کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے اس کی مناسب دیکھ بھال کرتی ہے۔

اب ہم اوپر بیان کیے گئے دوسرے مفروضے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کا مفہوم ”تعلیم بطور نشوونما“ کے تصور میں مضمر ہے۔ اس مفروضے کا جواز بالکل واضح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ عضویہ چاہے ایک پودا ہو یا جانور اپنے اندر حیاتیاتی نشوونما کے لیے قدرتی طور پر زبردست خواہش رکھتا ہے۔ اس نوع کے فطری تقاضے کے بغیر عضویہ کی حیاتیاتی نشوونما ممکن ہی نہ ہوتی۔ اسی طرح نفسیاتی نشوونما جسے ہم تعلیم کہتے ہیں، اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے اندر اس نوع کی نشوونما کے لیے زبردست قدرتی خواہش رکھتا ہو۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ انسان میں اس طرح کا کوئی فطری تقاضا موجود نہیں ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے، جس کی عدم صداقت سے ہم پہلے ہی واقف ہیں، کہ ایک قدرتی نشوونما کے عمل کے طور پر تعلیم ممکن ہی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی معلم قدرتی اور باطنی صلاحیت کی غیر موجودگی میں خارجی ذرائع یا مصنوعی طریقے سے انسان میں کوئی ایسی شے پیدا نہیں کر سکتا کہ جسے نشوونما کے طور پر بیان کیا جاسکے۔ دوسری طرف اگر نفسیاتی نشوونما کے لیے اس کی صلاحیت قدرتی اور باطنی ہے تو یہ (صلاحیت) صرف فطری اقتضا ہی کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اگر یہ بات معلم کے لیے ممکن بھی ہوتی کہ کسی مصنوعی طریقے سے نفسیاتی نشوونما کو کسی نوجوان فرد میں پیدا کر دے تو بھی یہ اس (نوجوان

فرد) کے لیے باطنی سطح پر فطری نشوونما نہ ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ (یہ کہا جاسکتا ہے کہ) ایسا کرنا اس کی شخصیت پر کسی شے کی خارجی مصنوعی بیوندکاری کا عمل ہوگا۔ چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے:

”تعلیمی نشوونما کے لیے فطری تقاضا کی وہ کیا خصوصیات ہیں کہ جس سے اس کی پہچان ہو سکتی ہے اور اسے انسان کے دیگر فطری تقاضوں سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے؟ نیز جس کی روشنی میں ہم اس کی مناسب تشفی کی شرائط معلوم کر سکتے ہیں؟“

اس سوال کا درست جواب تلاش کرنا ہی معلم کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اگر واقعی نشوونما کا عمل ہے جب کہ معلم انسان میں اس فطری تقاضا کی پہچان کرنے کا اہل نہیں ہے جو اس نشوونما کا باعث ہے تو وہ اس (نشوونما) کی صفات و خصوصیات کو نہیں جان سکتا۔ وہ تعلیم کا بحیثیت نشوونما بالکل درست نظریہ تخلیق نہیں کر سکتا، نتیجتاً اس کی کوششیں خردمندانہ طریقے سے بروئے کار نہ آئیں گی اور وہ مطلوبہ نتائج نہیں دے سکے گا۔ بد قسمتی سے جدید ماہرین تعلیم جن کی اس مسئلے کے حل کے لیے کوششوں کے متعلق کچھ کہنا تو درکنار اس بات ہی سے آگاہ نہیں ہیں کہ اس طرح کا کوئی مسئلہ وجود بھی رکھتا ہے۔ لیٹر سمٹھ نے بتایا ہے کہ یہ صورت حال اس حقیقت کے باوجود ہے کہ ان میں سب کے سب حیاتیاتی نظریات پر اعتماد کرنے والے بن چکے ہیں۔ وہ کبھی بھی انسان کی تعلیمی نشوونما کے عمل کا کسی عضویہ کے حیاتیاتی نشوونما کے عمل سے تقابل کرتے ہوئے نہیں تھکتے مگر اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کسی عضویہ کی حیاتیاتی نشوونما اس حقیقت کے باعث ہی ممکن بنتی ہے کہ وہ اس نوع کی نشوونما کے لیے باطنی فطری تقاضے کا حامل ہو۔ جب تک نفسیاتی نشوونما کے لیے انسان کا اس طرح کا باطنی فطری تقاضا نہ ہو (اس کی بھی) تعلیم بحیثیت نشوونما ممکن نہیں رہتی اور (یوں) انسان کی تعلیمی نشوونما اور کسی عضویہ کی حیاتیاتی نشوونما کے مابین تمام تقابلی تجربے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تعلیمی نشوونما کے لیے انسان کے فطری تقاضے کی ایک ایسی صفت سے ہم پہلے ہی واقف ہو چکے ہیں جس کے ذریعے اسے پہچانا جاسکتا ہے اور انسان کی فطرت کے دیگر فطری تقاضوں سے اسے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ فطری تقاضے کی وہ صفت یہ ہے کہ انسان اپنے جسم کی نہیں بلکہ ذات (نفس) کی نشوونما کا خواہش مند ہے۔ اس حیثیت میں اس کا تعلق انسان کی ان جبلتوں کے ساتھ قطعاً نہیں جن کا مقصد جسم کی پرورش اور نشوونما ہے۔ جب ہم انسان میں تعلیمی نشوونما کے لیے فطری تقاضے یا ذات کے فطری تقاضے کا اس کی جبلتوں کے ساتھ تعلق پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اس فطری تقاضے کی ایک اور خصوصیت کا اشارہ ملتا ہے جو ہمیں اسے پہچاننے کے قابل بناتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ گوانسانی شخصیت بہت سی مختلف خواہشات اور فطری تقاضوں پر مبنی ہے تاہم یہ سب مربوط ہو کر ایک اکائی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک جانور کی خواہشات اور فطری تقاضے جو کہ اس کی جبلتوں کی پیداوار ہوتے ہیں، کبھی متحدہ گُل (unified whole) کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ جبلت جانور کے ایک غیر چمک دار اور ناقابل متبدل میلان کا نام ہے جو اس کی حیات اور نسل کی بقا کے لیے ایک خاص انداز میں عمل کرتی ہے۔ ہر جبلت جانور پر اندرونی حیاتیاتی دباؤ ڈالتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس (دباؤ کے تقاضے) کو پورا کرنے پر

مجبور ہوتا ہے اور اسے جبَلّت کی اس تشفی سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ جب کبھی کسی جبَلّت کو تحریک ملتی ہے تو جانور پر اس تحریک کے مطابق ایسا عمل شروع کرنے اور اسے تکمیل تک پہنچانے کا زبردست دباؤ ہوتا ہے جو اس کی تشفی کے لیے ضروری ہے۔ جانور کسی برتر مقصد کی خاطر کسی جبَلّت کی تشفی سے نہ رک سکتا ہے نہ (اس کی) مخالفت کر سکتا ہے اور نہ (اس پر) کوئی حد لگا سکتا ہے۔ فی الحقیقت جانور کا کوئی بلند تر ہدف یا مقصد ہوتا ہی نہیں۔ اگر کوئی جانور اپنی کسی جبَلّت کے خلاف عمل کرتا ہوا پایا جاتا ہے تو یہ مخالفت اس کے کسی رضا کارانہ انتخاب کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ یہ ہمیشہ ایک جبَلّت کا دوسری جبَلّت کی مخالفت کا معاملہ ہوتا ہے۔ زیادہ طاقت ور جبَلّت خود سے کمزور جبَلّت کو شکست دے دیتی ہے اور نسبتاً کمزور جبَلّت خود بخود زیادہ طاقت ور جبَلّت کی قوت کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ انسان کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے۔

انسان اعلیٰ حیوانات کی تمام جبَلّتوں کا حامل ہے جیسے کہ کھانا کھانا، جنسی جذبہ، بندش سے فرار، جنگ جونی، نمود ذات، اہانت ذات وغیرہ۔ علاوہ ازیں انسان میں ان جبَلّتوں کا بنیادی کردار وہی ہے جو اعلیٰ جانوروں میں ہے۔ میکڈوگل نے جبَلّت کی جو تعریف کی ہے اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جبَلّت کا اطلاق انسانوں اور جانوروں پر یکساں ہوتا ہے۔ وہ جبَلّت کی تعریف یوں کرتا ہے کہ ”جبَلّت ایک موروثی اور پیدائشی، نفسیاتی و جسمانی رجحان ہے جو حامل جبَلّت کو اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ ایک خاص نوعیت کی چیزیں سامنے آئیں تو انہیں محسوس کرے اور ان کی طرف توجہ دے۔ نیز اس قسم کی شے کو محسوس کر کے ایک خاص نوعیت کے جذباتی ہیجان کے تجربے سے گزرے اور اس کے حوالے سے خاص قسم کا طرزِ عمل اختیار کرے یا کم از کم اس قسم کے طرزِ عمل کے لیے تحریک محسوس کرے۔“

تاہم جانوروں کے برعکس انسان اپنی کسی بھی جبَلّت کے اظہار اور تسکین کے عمل کو جس حد تک چاہے روکنے اور اس کے خلاف مزاحمت کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ انسان کی اپنی جبَلّتوں کے خلاف مزاحمت بے سوچے سمجھے یا غیر ارادی طور پر نہیں ہوتی جیسے کہ ایک جانور کے معاملے میں ہوتا ہے بلکہ (انسان کا یہ عمل) اس کے آزاد اور ارادی انتخاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جبَلّتوں کے خلاف کچھ اس طرح مزاحمت کرتا ہے کہ اس کے دوران میں اس کی کسی خاص جبلی تحریک کی تسکین نہیں ہو رہی ہوتی۔ وہ اکثر اپنی مرضی سے منتخب کردہ ایک مخصوص طرزِ عمل چھوڑنے کے بجائے اپنی جبَلّتوں کو تسکین سے محروم رکھتا ہے، یہاں تک کہ اپنی جان سے گزر جاتا ہے جس (جان) کی حفاظت ہی جبَلّتوں کا کام ہے۔

جانور کی زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی سرگرمیوں کے ایک سلسلے پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر سرگرمی پر جبَلّت کا راج ہوتا ہے اور اس کی کسی سرگرمی کا سابقہ یا آئندہ سرگرمی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دوسری طرف انسان کی زندگی میں ایک کُل (whole) کی صورت میں منظم ہونے کا میلان پایا جاتا ہے اور ہر جبَلّت کی سرگرمی، جس حد تک اسے کام کرنے کی اجازت ہوتی ہے، عضوی طور پر اسی کُل سے جڑی ہوتی ہے۔ انسان میں جبلی خواہشات کی یہ تنظیم یا اتحاد جو اس کی ان (جبَلّتوں) کے خلاف مزاحمت کرنے کی اہلیت کا نتیجہ ہے، اس وقت تک ممکن نہیں جب

تک وہ ایک ایسی خواہش یا فطری تقاضا نہ رکھتا ہو جو ان سب (جہلتوں) پر حاوی ہونے اور ان کو قابو میں رکھنے کی قدرت رکھتا ہو۔

ایک درجن گھوڑوں سے کھینچے جانے والی گاڑی کا تصور کیجیے۔ اگر سب گھوڑے گاڑی کو مختلف سمتوں میں کھینچ رہے ہوں اور گاڑی کبھی ایک سمت میں چل رہی ہو تو کبھی دوسری سمت میں، تو ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ گھوڑوں کو قابو کرنے کے لیے گاڑی کے اندر کوئی کوچوان نہیں ہے۔ اگر گاڑی ایک ہی سمت میں تیز رفتاری کے ساتھ اور بغیر ہچکولے کھائے چل رہی ہو تو یہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ گھوڑوں کی باگ کسی کوچوان کے ہاتھ میں ہے جو ان کو چلا رہا ہے اور جو گاڑی کی منزل سے بخوبی واقف ہے۔ ایک بالغ انسان کی سرگرمی کوچوان کے بغیر کسی ایسی گاڑی کی حرکت کی طرح نہیں ہوتی کہ جس کو بہت سے گھوڑے مختلف سمتوں میں کھینچ رہے ہوں بلکہ یہ تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی ایسی گاڑی کی طرح ہے جسے کوئی ایسا انسان چلا رہا ہو جو اس کو کھینچنے والے سب گھوڑوں پر مکمل قابو رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے سے نہیں رہ سکتے کہ انسان میں ایک خواہش یا فطری تقاضا ہے جو اس کی تمام جبلی یا حیوانی فطری تقاضوں پر حاوی ہے اور ان کو اپنے قابو میں رکھتا ہے۔

کششِ ثقل کی قوت اور دیگر مادی قوانین کے برخلاف جانوروں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر اپنی جہلتوں کی تشفی کرے۔ (عضویاتی لحاظ سے) نشوونما یافتہ ہونے اور جہلتوں کے فطری تقاضے کی اکساہٹ کے باعث اس میں مادی قوانین کی مزاحمت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جانوروں کے برعکس انسان کسی ایسے فطری تقاضے کا یقیناً حامل ہے جس کی اس نے ارتقائی عمل کے دوران میں اپنے اندر خاص طور پر پرورش کی ہے اور جس کے باعث وہ اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اپنی حیوانی جہلتوں کی مزاحمت کا سامنا کر سکے۔ چوں کہ یہ فطری تقاضا یا ہیجان جو انسانی شخصیت کی گاڑی میں کوچوان کی حیثیت رکھتا ہے، حکمرانی کرنے والا ہیجان ہے جو اپنے اظہار اور تشفی کی خاطر بلا استثناء اپنی تمام جہلتوں کو روک سکتا اور ان کو قابو میں لاسکتا ہے اس لیے یہ خود اپنی جہلتوں میں سے ایک نہیں ہو سکتا۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ اپنی ذات کے اس فطری تقاضا یا ہیجان کے سوا کچھ نہیں جسے ہم پہلے ہی جانتے ہیں، یعنی تعلیمی نشوونما کے لیے اس کا فطری ہیجان۔ یوں ہمیں تعلیمی نشوونما کے لیے انسان کے ہیجان کی ایک اور خصوصیت کا پتا چلتا ہے کہ جس کے ذریعے اسے پہچانا اور شناخت کیا جاسکتا ہے، یعنی یہ کہ یہ (فطری تقاضا) اس کی فطرت کا حکمران ہیجان ہے۔ چنانچہ اب یہ جاننے کے لیے کہ انسان کے مختلف فطری تقاضوں میں سے تعلیمی نشوونما کے لیے اس کا ہیجان کون سا ہے، ہمیں صرف یہ کام کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے ہیجانوں کی مکمل فہرست اپنے سامنے رکھیں اور پھر اس میں سے ان تمام خواہشات کو نکال دیں جو جبلی ہیں جو انسان اور جانوروں میں یکساں ہیں اور جن کا مقصد جسم کی پرورش اور نشوونما ہے۔ آخر میں اس کی باقی رہ جانے والی ہر خواہش کا دیگر خواہشات کی نسبت سے جائزہ لیا جائے تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ ان میں سے کون سی (خواہش) باقیوں پر حاوی ہے۔

(جاری ہے)



## مباحث عقیدہ (۲۷)

مؤمن محمود

### عقیدہ تقدیر: توحید کی بنیاد

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت منقول ہے جو اگرچہ سنداً ضعیف ہے، تاہم سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً بھی ثابت ہے۔ اس میں ارشاد ہوا:

الْقَدَرُ نِظَامُ التَّوْحِيدِ، فَمَنْ وَحَّدَ اللَّهَ وَأَمَّنَ بِالْقَدَرِ تَمَّ تَوْحِيدُهُ، وَمَنْ وَحَّدَ اللَّهَ وَكَذَّبَ بِالْقَدَرِ نَقَضَ تَكْذِيبُهُ تَوْحِيدَهُ

”عقیدہ تقدیر توحید کا نظام ہے (یعنی توحید کو جمع رکھنے والی شے ہے)۔ چنانچہ جس نے اللہ کی توحید کے ساتھ تقدیر پر بھی ایمان رکھا، اس کی توحید مکمل ہوگئی؛ اور جس نے توحید کا اقرار تو کیا مگر تقدیر کو جھٹلایا، اس کی اس تکذیب نے توحید کو بھی توڑ دیا۔“

یہاں سے معلوم ہوا کہ عقیدہ تقدیر توحید کی بنیاد ہے۔

اسی بنیاد پر امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”کتاب التوحید والتوکل“ میں توحید کی وہ تیسری قسم بیان کی ہے جس سے توکل پھوٹتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ توحید کی چار اقسام ہیں۔ چار سے یہ مراد نہیں کہ ہر قسم دوسرے سے متضاد ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک میں اجمال ہے تو دوسری میں تفصیل؛ ایک ہی حقیقت کے مختلف مدارج ہیں۔

### توحید کی چار اقسام

پہلی توحید وہ ہے جو نفع نہیں دیتی، یعنی منافقین کی توحید۔ وہ زبان سے تو ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کہتے ہیں، لیکن دل چونکہ ایمان سے خالی ہے اس لیے یہ توحید نافع نہیں۔ دوسری توحید عوام الناس کا درجہ ہے جو نظری طور پر اللہ کو معبود مانتے ہیں، مگر ان کے اعمال میں کوتاہیاں ہیں، توکل میں بھی خلل ہے اور اعمالِ قلبیہ بھی انہیں پوری طرح حاصل نہیں۔ بائیں ہمہ یہ ”لا الہ الا اللہ“ کی توحید قیامت کے دن انہیں نفع دے گی اور جہنم سے نجات کا ذریعہ بنے گی۔ تیسری قسم وہ توحید ہے جس میں انسان ”لَا فَاعِلَ فِي الْحَقِيقَةِ إِلَّا اللَّهُ“ کا مشاہدہ کرتا ہے، یعنی یہ دیکھتا ہے کہ حقیقت میں اللہ کے سوا کوئی فاعل نہیں۔ یہی وہ توحید ہے جس سے توکل جنم لیتا ہے؛ اگر یہ توحید نصیب نہ ہو تو انسان متوکل نہیں بن سکتا۔ توحید کی چوتھی قسم کو امام غزالیؒ ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں: ”أَلَا يُرَى فِي الْوُجُودِ إِلَّا وَاحِدًا“ یعنی انسان صرف وحدت ہی کو دیکھے اور کثرت اس کے پیش نظر نہ رہے۔ اسی کو صوفیاء فناء فی التوحید سے تعبیر کرتے

ہیں۔ توحید کا یہ درجہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے بلکہ توحید کی تیسری قسم ہمارا موضوع ہے۔

یہ توحید دراصل عقیدہ تقدیر ہی سے پھوٹی ہے۔ عقیدہ تقدیر یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کی مرضی اور اس کے ارادے کے تحت ہو رہا ہے؛ یہاں غیر اللہ کا کوئی تصرف نہیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مشیت کے بغیر ایک پتہ تک نہیں بل سکتا۔ یہی وہ توحید ہے جس کی تلقین اللہ کے نبی ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ کو فرمائی تھی۔ سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے نبی ﷺ کے پیچھے سوار تھا کہ آپ ﷺ نے مجھے چند کلمات کی تعلیم دی۔ (واضح رہے کہ جب اللہ کے نبی ﷺ کا وصال ہوا تو ابن عباسؓ کی عمر بارہ برس تھی؛ یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہے جب آپؓ نو دس برس کے رہے ہوں گے) ارشاد فرمایا:

((يَا غُلَامُ، إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ: احْفَظِ اللَّهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللَّهَ تَجْعَدُ لَهُ مُجَاهَدًا، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ لَكَ، وَلَوْ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجُمِعَتِ الصُّحُفُ)) (رواه احمد والترمذی)

”اے لڑکے! میں تمہیں کچھ باتیں سکھاتا ہوں: اللہ (کے احکام اور حدود) کی حفاظت کرو اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کا دھیان رکھو اسے ہمیشہ اپنے سامنے پاؤ گے۔ جان لو کہ اگر ساری امت (بلکہ تمام نوع انسانی) تمہیں کوئی نفع پہنچانے پر جمع ہو جائے تو اس سے زیادہ نفع نہیں پہنچا سکتی جتنا اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے؛ اور اگر سب تمہیں نقصان پہنچانے پر تمل جائیں تو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا دیے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے۔“

یہاں احفظ اللہ کا لغوی ترجمہ اگرچہ ”اللہ کی حفاظت کرو“ ہی ہے مگر مراد اللہ کے احکام اور اس کی حدود کی حفاظت ہے جیسا کہ قرآن میں اہل ایمان کی صفت بیان ہوئی: ”وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ“۔ حدیث کے آخری کلمات ”قلم اٹھا دیے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے“ ہی تقدیر کی جان ہیں یعنی اب کوئی تبدیلی ممکن نہیں سب کچھ طے ہو چکا؛ اقلام نے جن صحیفوں پر تقدیر لکھی وہ بھی خشک ہو چکے اب اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ یہی وہ عقیدہ تقدیر ہے جس سے توکل پھوٹتا ہے۔

بعض نادانوں نے یہ سمجھا کہ اس عقیدے سے مسلمان کم ہمتی اور پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو ایک اعلیٰ درجے کی قوت عطا کرتا ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اللہ کے سوا کسی میں نفع و نقصان کا اختیار نہیں دیکھتا اور کسی کے سامنے سر نیاز خم نہیں کرتا اس سے زیادہ با حوصلہ اور قوی انسان بھلا کون ہوگا! جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿إِذْ يَأْتِيَنَّكَ قُورَيْشُ بِهَدْيٍ بَهِيمٍ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَوَاحِدُ الْقَهَّارِ ۝﴾ (یوسف)

”کیا متفرق اور جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو کیٹا بھی ہے اور سب پر غالب و قہار بھی؟“



بعض علماء اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو شخص جس چیز میں تاثیر ذاتی کا عقیدہ رکھتا ہے اس نے دراصل اسے اپنا رب بنا لیا ہے۔ خواہ وہ کوئی سبب ہو، کوئی شخصیت، کوئی ستارہ، کوئی بت، کوئی پتھر یا درخت یا کوئی جدید آلہ؛ جس کسی میں بھی وہ ذاتی تاثیر کا قائل ہو، اسے معبود بنا بیٹھا۔ اس کے مقابلے میں عقیدہ تقدیر مسلمان کو یہ سکھاتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے پاس نہ کوئی قدرت ہے نہ تصرف اور اللہ کے سوا کسی کا ارادہ اس کائنات میں نافذ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ صرف ایک ہی ہستی کو رب مانتا ہے؛ پھر اس سے زیادہ قوی انسان کون ہوگا!

یہ عقیدہ انسان کے اندر سے عُجب اور تکبر کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ عُجب اور تکبر تب پیدا ہوتے ہیں جب انسان اپنے آپ کو دیکھے؛ اپنے اعمالِ صالحہ، اپنے علم، فن، ذہانت اور کمال کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرے۔ جب عقیدہ تقدیر اس کا حال بن جاتا ہے تو وہ ہر چیز کو اللہ کے فضل کے طور پر دیکھتا ہے اور کسی چیز کی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا:

﴿وَمَا بِكُمْ مِّن تَعَبَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾ (النحل: ۵۳)

”اور تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے، وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔“

## عقیدہ تقدیر کے منافع

سویہ عقیدہ انسان کے باطن سے اُن رذائل اور فاسد اعمالِ قلبیہ کا استیصال کر دیتا ہے۔ جس کا عقیدہ تقدیر اس کا حال بن جائے، وہ مخلوق کو بھی عذر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو بُرے کام کرتے دیکھتا ہے اور یقیناً نبی عن المنکر بھی کرتا ہے؛ مگر اس کے نبی عن المنکر میں ایک شفقت اور رحمت کی آمیزش ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس سے یہ اعمال سرزد ہو رہے ہیں، وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اللہ کی تقدیر کے تابع ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ ”یہ تو اللہ کی تقدیر ہے“ کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر لے؛ عذر دینے سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ گناہ گار کو شفقت و رحمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسی کی دلیل میں علماء وہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے اللہ کے نبی ﷺ کی دس برس خدمت کی۔ وہ فرماتے ہیں:

خَدَمْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَشْرَ سِنِينَ، فَمَا قَالَ لشيءٍ فَعَلْتُهُ؟ لِمَ فَعَلْتُهُ؟ وَلَا لشيءٍ لَمْ أَفْعَلْهُ؛ لِمَ لَا فَعَلْتُهُ؟ وَكَانَ بَعْضُ أَهْلِهِ إِذَا عَتَبَنِي عَلَى شَيْءٍ يَقُولُ: دَعُوهُ، فَلَوْ قَضَى شَيْءٌ لَّكَانَ

(مسند احمد، صحيح البخاری، صحيح مسلم)

”میں نے دس برس اللہ کے نبی ﷺ کی خدمت کی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے کوئی کام کر لیا ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا ہو کہ یہ کیوں کیا؟ یا کوئی کام نہ کیا ہو تو پوچھا ہو کہ یہ کیوں نہ کیا۔ اور اگر آپ ﷺ کے گھر والوں میں سے کوئی مجھے ڈانٹتا تو آپ ﷺ فرماتے: ”اسے چھوڑ دو اگر تقدیر میں ہوتا تو ہو ہی جاتا۔“

یہاں سے معلوم ہوا کہ بہت سے مواقع پر جہاں انسان خواہ مخواہ برہم اور سیخ پا ہوتا ہے وہاں اسے تقدیر کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ گلاس گر کر ٹوٹ گیا، یا کسی نے کوئی کام بگاڑ دیا تو غصے میں آنے کے بجائے یہ سوچے کہ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ ہم عقیدہ تقدیر پر ایمان تو رکھتے ہیں، اگر اسے اپنا حال بنالیں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خود کو بہت سی اذیت اور پریشانی



سے بچا سکتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ راستے میں ہیں اور ایک راہ کے بجائے دوسری اختیار کر لی، اور آگے جا کر گاڑیوں کے جھوم میں پھنس گئے۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ خود کو کوسٹے رہیں کہ فلاں راستے سے چلا جاتا تو بہتر تھا، اور یوں ذہنی الجھن میں مبتلا رہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یقین رکھیں کہ اللہ کی تقدیر یہی تھی کہ اسی راہ سے آنا تھا، اور کیا عجب کہ اللہ نے اسی سبب کچھ اندیشوں سے محفوظ رکھ لیا ہو، مجھے کیا خبر کہ دوسری راہ پر کیا پیش آتا! غرض ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اللہ کے نبی ﷺ تقدیر کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ لہذا ہمیں بھی اسے عمل میں لانا چاہیے تاکہ عقیدہ تقدیر محض ایک نظری بحث بن کر نہ رہ جائے بلکہ ہمارے اعمال سے اس کا اظہار ہو۔

قرآن مجید میں اس عقیدے کو بطور خاص مصیبت کے موقع پر نمایاں کیا گیا ہے۔ جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ اللہ نے یہ مصیبت پہلے سے لکھ رکھی تھی، تو وہ ”کاش ایسا ہو جاتا، کاش ویسا ہو جاتا!“ کے حسرت ناک کلمات سے بچ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلَكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللَّهُ وَمَا شَاءَ

فَعَلْتُ، فَإِنْ “لَوْ” تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ)) (صحیح مسلم: ۲۶۶۳)

یعنی جب تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو یہ نہ کہہ کہ ”اگر میں یوں کرتا تو یوں ہو جاتا،“ بلکہ یوں کہہ: ”اللہ نے ایسا مقدر کیا، اور جو اُس نے چاہا، کر دیا۔“ کیونکہ ”لو“ (کاش) کا کلمہ شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

یہی مضمون قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (الحديد: ۲۲)

”کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں، مگر وہ ایک کتاب میں (پہلے سے) درج ہے، قبل اس کے کہ ہم اسے پیدا کریں؛ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔“

اور زندگی میں اس کا اثر کیا ظاہر ہونا چاہیے؟

﴿لِكَيْ لَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ (الحديد: ۲۳)

”تاکہ تم اس پر زیادہ غم نہ کرو جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا، اور نہ اس پر اتر آؤ جو تمہیں عطا ہوا۔“

یہی عقیدہ تقدیر کا ثمر ہے۔ اسی طرح سورۃ التغابن میں فرمایا:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ﴾ (آیت ۱۱)

”کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے اذن سے؛ اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اللہ اس کے دل کو ہدایت (اور) اطمینان کی راہ (دکھا دیتا ہے)۔“

اسی مضمون کی ایک روشن مثال سورہ آل عمران میں غزوہ اُحد کے ذکر میں ہے۔ اُحد میں مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور ستر صحابہ شہید ہوئے۔ اس موقع پر منافقین کی زبان پر بار بار یہی کلمہ ”لو“ آیا، اور اللہ تعالیٰ نے متعدد بار اس کی نفی فرمائی۔ وہ کہتے تھے:

﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قَتَلْنَا هَؤُلَاءِ﴾ (آل عمران: ۱۵۴)

”اگر ہمارے اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔“

ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم گھروں میں رہتے اور باہر نہ نکلتے تو آج مارے نہ جاتے۔ اللہ نے جواب دیا:

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ﴾

(آل عمران: ۱۵۴)

”کہہ دیجیے: اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے، تب بھی جن کے مقدر میں قتل ہونا لکھا جا چکا تھا، وہ نکل کر اپنی قتل گاہوں تک ضرور پہنچ جاتے۔“

اور خود اللہ کے نبی ﷺ سے بھی فرما دیا گیا کہ ٹھیک ہے جو کوتاہی ہوئی، اس کا احساس کیجیے اور اصلاح فرمائیے، مگر اب ان لوگوں کو ملامت نہ کیجیے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (آل عمران)

”سو آپ انہیں معاف کر دیجیے، ان کے لیے استغفار کیجیے اور معاملات میں ان سے مشورہ لیجیے، پھر جب (کسی بات کا) پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے۔“

یہ سب باتیں عقیدہ تقدیر ہی سے پھوٹی ہیں۔ اسی مضمون کا ایک جامع بیان سورۃ التوبہ میں یوں آیا:

﴿قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾

”کہہ دیجیے: ہمیں ہرگز کوئی چیز نہ پہنچے گی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے، وہی ہمارا مولا ہے، اور اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

اس آیت میں ایک لطیف نکتہ ہے۔ عربی میں ”کَتَبَ عَلٰی“ بھی آتا ہے اور ”کَتَبَ لَهُ“ بھی۔ ”کَتَبَ لَهُ“

کا مطلب ہے کسی کے حق اور موافقت میں لکھنا۔ سو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ہمیں وہی پہنچے گا جو اللہ نے ہمارے حق میں

لکھا ہے۔ اور ”هُوَ مَوْلَانَا“ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم چونکہ صاحب ایمان اور صبر کرنے والے ہیں اس لیے ہمیں جو تکلیف

بھی پہنچے گی، وہ اپنے انجام میں ہمارے ہی حق میں بہتر ہوگی؛ وہ ہمیشہ ہمارے حق ہی میں ہوگی۔ اور ”وَعَلَى اللَّهِ

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ“، یعنی اہل ایمان کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

عقیدہ تقدیر کا صوفیانہ اظہار

صوفیاء اس عقیدے کو ایک اور پیرائے میں بیان فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تقدیر کو یوں نہ دیکھو گویا تم اللہ

سے برسرِ پیکار ہو۔ اکثر ہم کہہ اٹھتے ہیں: ”اللہ نے لکھ دیا تو میں کیا کروں!“ گویا اللہ سے کوئی کشمکش جاری ہے کہ میں

کچھ اور چاہتا تھا اور اس نے کچھ اور لکھ دیا۔ دین کی روح اور اس کا جوہر تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی محبت ہے، اور اسی پر ثناء اور

فدا ہو جانے کی تڑپ ہے۔ سو جب تمہاری محبوب وہی ہستی ہے، تو یہ بات تو تمہارے لیے سراسر باعثِ اطمینان ہونی

چاہیے کہ دنیا کو میرا محبوب ہی چلا رہا ہے؛ پوری کائنات جس کے ارادے سے چل رہی ہے، وہ وہی ہے جو میرا محبوب

ہے۔ میں تو برضا و رغبت اپنی مرضی اور اپنے ارادے کو اسی کے ارادے میں ضم کرنے کو تیار تھا، اور اب تکوینی طور پر مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرا ارادہ اور اختیار اصلاً بھی اللہ ہی کے اختیار میں ضم اور اسی کے تابع ہے۔ اس سے تو ایک خاص قسم کا تعلق اور ایک خاص قسم کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ سو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمارا محبوب ہے، ہمارا حریف یا دشمن نہیں۔ غرض عقیدہ تقدیر محض ایک خشک مسئلہ نہیں، بلکہ یہ انسان کے اندر توکل اور تواضع کے جذبات پیدا کرنے والا عقیدہ ہے۔

## عقیدہ تقدیر گناہوں کا جواز نہیں

البتہ ایک بات سے ہمیں روکا گیا ہے: عقیدہ تقدیر کو اپنے گناہوں کے جواز کے لیے دلیل نہ بنایا جائے۔ یہی تو شیطنیت ہے۔ شیطان سے ایک لغزش ہوئی کہ اس نے سجدہ نہ کیا؛ پھر جب پوچھا گیا کہ تُو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ تو اس نے اپنا وبال اور اپنا جرم اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ڈال دیا۔ کہنے لگا:

﴿فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝﴾ (الاعراف)

”چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا، اس لیے میں بھی تیری سیدھی راہ پر ان (انسانوں) کی گھات میں بیٹھوں گا۔“

یہ شیطان کا عجیب فلسفہ ہے: گمراہ تُو نے کیا ہے، مگر تجھ سے تو میں بدلہ نہیں لے سکتا، لہذا اب میں تیرے بندوں کی سیدھی راہ پر جا بیٹھوں گا اور جو بھی اس راہ پر چلے گا، اسے بہکاؤں گا اور ”لَا أُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ“ کہ سب کو بہکا کر رہوں گا۔ سو شیطنیت یہ ہے کہ اچھے عمل کی نسبت فوراً اپنی طرف کر لی جائے، اور کوئی بُرا عمل سرزد ہو تو اس کی نسبت کسی اور کی طرف، بلکہ نعوذ باللہ خدا کی طرف کر دی جائے۔ اس کے مقابلے میں آدمیت یہ ہے کہ نیک عمل کی نسبت اپنی طرف نہ کی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَا لِلنَّاسِ رَسُولًا ۖ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝﴾ (النساء)

”تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو برائی پہنچے وہ تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔“

سو جو برے اعمال ہم سے سرزد ہوں یا جو تکلیفیں ہم پر آئیں، ان کی نسبت اپنی طرف کرنا ہی آدمیت ہے:

﴿قَالُوا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝﴾ (الاعراف)

”وہ دونوں کہنے لگے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تُو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم یقیناً خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

یہ احتیاط ہمیں عمل کی سطح پر پیش نظر رکھنی چاہیے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقیدے میں بھی یہی احتیاط برتی جائے۔ عقیدہ تو یہی ہے کہ خیر و شر سب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہے؛ البتہ ادب یہ ہے کہ شر کی نسبت اللہ کی طرف نہ کی جائے۔ اس کے پیچھے کچھ گہرے مباحث بھی ہیں کہ شر کی نسبت اللہ کی طرف کیوں نہیں کی جاتی، جنہیں ہمارے علماء نے تفصیل سے کھولا ہے؛ وہ فی الحال ہمارا موضوع نہیں، کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ ان پر بھی گفتگو ہوگی۔

جیسا کہ ہم (گزشتہ اقساط میں) سمجھ چکے ہیں، ایک انتہا پر قدریہ ہیں، اور ان سے کچھ ہلکے معترضہ؛ جب کہ دوسری انتہا پر جبریہ ہیں۔ ایک گروہ (قدریہ) انسان کو کامل اختیار دیتا ہے، اور جبریہ انسان سے اختیار کی یکسر نفی کر کے اسے مجبور ٹھہراتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان اہل سنت ہیں، جو کہتے ہیں کہ انسان کو ارادہ اور اختیار حاصل ہے، مگر اس کا ارادہ اور اختیار اللہ ہی کے ارادے اور اختیار سے ظہور پذیر ہوتا ہے؛ اور اسی اختیار کی بنا پر اسے خدا کے حضور جواب دہ ہونا ہے اور اس کا محاسبہ ہوگا۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان اپنے اختیار میں مطلق خود مختار نہیں، یعنی اپنے ارادے پر اسے مکمل اختیار حاصل نہیں۔

## اختیار بھی اختیاری نہیں

اس کی توجیہ علماء نے بہت گہری سطح پر کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اختیار اپنی فلسفیانہ حقیقت میں بذاتِ خود مختار نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اختیار پر اثر انداز ہونے والے عوامل پر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ چنانچہ انسان جس نوع کا بھی اختیار رکھتا ہو، بالآخر اس کے اختیار پر اثر انداز ہونے والے محرکات، بواعث، اور اسے کسی سمت کی طرف اُبھارنے والے اسباب یہ سب وہی ہیں جن پر انسان کا اختیار نہیں۔

ہمارا اختیار کسی چیز کی مصلحت کے علم کے تابع ہوتا ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں چیز ہمارے حق میں نافع ہے، تو ہم اس کا ارادہ کر لیتے ہیں؛ اور یہ علم کہ کوئی چیز ہمارے لیے نافع ہے یا نہیں، اور اسے پیدا کرنے والے عوامل کیا ہیں، ان پر انسان کو کامل اختیار حاصل نہیں۔ مثال کے طور پر مجھے پیاس لگی ہے، سامنے پانی رکھا ہے، اور مجھے یقین علم ہے کہ یہ میری پیاس بجھا سکتا ہے، تو میں فوراً ارادہ کر کے وہ پانی اٹھا لوں گا۔ یہاں ہوایہ کہ میرا ارادہ اور اختیار اس علم کے تابع تھا کہ یہ پانی میرے لیے نافع ہے۔ یہ علم کہ یہ چیز میرے لیے نافع ہے، اس کے پیچھے ایسے بہت سے دوائی اسباب اور عوامل کا فرما ہوتے ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں۔ یہ بات میں اس لیے کر رہا ہوں کہ آگے چل کر اہل سنت ہی کا ایک ایسا مسلک زیر بحث آئے گا جو معترضہ کہ کچھ قریب ہے، مگر اس کے پیچھے کارفرما فلسفے کی رو سے وہ بھی یہی مانتے ہیں کہ بالآخر اختیار اللہ ہی کا ہے۔ سو یہ بات ذہن نشین رہے کہ انسان کا اختیار بھی اپنی فلسفیانہ حقیقت میں بذاتِ خود مختار نہیں ہوتا۔

## اہل سنت کا مسلکِ وسط

اب ان دو انتہاؤں یعنی قدریہ و معترضہ ایک طرف اور جبریہ دوسری طرف کے بیچ میں اہل سنت واقع ہیں۔ اہل سنت نے چند باتوں پر اتفاق کیا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ بندوں کے اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ معترضہ اس پر متفق نہ تھے؛ ان کا کہنا تھا کہ انسان کے اختیاری اعمال کا خالق خود انسان ہے، اللہ نہیں۔ اہل سنت نے اس کے برخلاف طے کیا کہ خالق اللہ ہی ہے؛ وہی انسان کے ارادے کا خالق ہے اور وہی اس کی قدرت کا۔ ان اصولوں کو تسلیم کر لینے کے بعد اہل سنت کا ایک دائرہ متعین ہو گیا، اور ان کا ماننا ضروری تھا۔

اس کے بعد اہل سنت کے مابین کئی اختلافات ہوئے اور اس میں کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ جب چند بنیادی اور اصولی باتیں مان لی گئیں، تو بعد میں مسئلے کی تعبیر اور بیان میں ایک سے زائد آراء کا آجانا فطری ہے۔ چنانچہ اہل سنت کے چند بڑے مسالک ہیں۔ ایک مسلک اشاعرہ کا ہے، ایک ماتریدیہ کا؛ اور ایک مسلک انہی سے قریب ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ کا ہے، اور اسی سے ملتا جلتا مسلک امام الحرمین ابوالمعالی الجوبینی رحمہ اللہ کا۔ پھر ایک اور مسلک بھی ہے جس سے بیشتر متکلمین اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ شیخ اکبر ابن عربی علیہ الرحمہ کا مسلک ہے۔

## اشاعرہ کا مذہب

اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ کائنات میں جو بھی واقعہ رونما ہوتا ہے، وہ سبیت کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ براہ راست اللہ کی طرف سے تخلیق کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ نے یہ قلم اس طرح گرایا تو ایک اس کا گرنا ہے اور ایک آواز کا پیدا ہونا؛ آواز کا پیدا ہونا الگ واقعہ ہے اور قلم کا گرنا الگ اور دونوں کا مستقل خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ ایسا نہیں کہ اللہ نے اجسام میں یہ خاصیت رکھ دی ہو کہ جب دو جسم ٹکرائیں گے تو صوتی لہریں پیدا ہوں گی، بلکہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔ اشاعرہ انسانی ارادے اور اختیار کو بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر جس وقت کسی چیز کا ارادہ پیدا ہوتا ہے، وہ ارادہ براہ راست اللہ کی مخلوق ہوتا ہے؛ اس کے پیچھے اسباب کا کوئی سلسلہ نہیں۔ اگر بالفرض اسباب کا سلسلہ مان بھی لیا جائے کہ فلاں داعیہ اور فلاں محرک پیدا ہوا، تو وہ داعیہ اور محرک بھی براہ راست اللہ ہی کی تخلیق ہے، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی چیز بھی۔

## ارادہ جزوی و کلی

یہاں ایک لطیف اصطلاحی فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ انسان کے اندر جو ارادہ پیدا ہوتا ہے، اسے ”جزوی ارادہ“ کہتے ہیں، بمقابلہ ”کُلّی ارادے“ کے۔ کُلّی ارادہ یہ ہے کہ میرے اندر صلاحیتِ ارادہ موجود ہے۔ اسے منطقی و نحوی اصطلاح میں ”مصدری معنی“ کہا جاتا ہے، یعنی محض صلاحیت، جس میں زمانہ ملحوظ نہیں ہوتا۔ جب میں اس صلاحیت کو بروئے کار لا کر کوئی خاص ارادہ کرتا ہوں مثلاً یہ کہ ”میں قلم اٹھاؤں“ تو یہ ”جزوی ارادہ“ ہے، جسے ”حاصل بالمصدر“ کہتے ہیں۔ (نحو میں یہی فرق مصدر اور فعل کا ہے: ”فَعَلَ يَفْعَلُ فِعْلًا“ میں ”فِعْل“ مصدر ہے، یعنی محض صلاحیت و ماہیت، جس میں زمانہ نہیں؛ لیکن جب اسے ماضی یا مضارع کی صورت دی جائے تو کوئی متعین فعل مراد ہوتا ہے، جیسے ”كَتَبَ“ یا ”يَكْتُبُ“۔ اسی لیے کہتے ہیں: ”عِنْدَهُ مَهَارَةُ الْكِتَابَةِ“، یعنی اس میں لکھنے کی صلاحیت ہے، اور ”الآن هُوَ يَكْتُبُ“، یعنی وہ اس وقت لکھ رہا ہے۔) سو ہم صبح و شام جو بے شمار ارادے کرتے ہیں، وہ سب ارادہ جزوی ہیں۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ یہ ارادہ جزوی بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے۔ یہیں سے ان شاء اللہ آگے چل کر اشعری اور ماتریدی مسلک کا فرق واضح ہوگا۔

اشاعرہ کا کہنا ہے کہ پانی پینے، کتاب اٹھانے، گاڑی چلانے، یا سفر کرنے کا یہ جو جزوی ارادہ تم کرتے ہو، یہ سب

براہِ راست اللہ کی طرف سے فوراً تخلیق ہوتے ہیں اور اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ارادے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ ارادہ تو ارادے سے پیدا ہوتا ہے جب کہ عمل قدرت سے۔ صفات کی بحث میں ہم دیکھ چکے کہ ارادہ تخصیص کرتا ہے۔ قدرت تو میرے پاس قلم اٹھانے کی بھی ہے اور کتاب اٹھانے کی بھی مگر یہ کہ اس وقت قلم ہی کیوں اٹھا رہا ہوں؟ کتاب کیوں نہیں؟ یہ ارادے سے طے ہوتا ہے؛ البتہ اٹھاؤں گا قدرت سے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا میری قدرت سے فعل پیدا ہوتا ہے؟ اہل سنت تو قائل ہیں کہ فعل اللہ کی مخلوق ہے وہ قدرت سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

## تصورِ کسب

تو پھر یہ قدرت کیا کرتی ہے؟ اشاعرہ کہتے ہیں کہ جب انسان کے اندر جزوی ارادہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی قدرت کو کسی چیز کی طرف متوجہ کرتا ہے تو اُس قدرت سے کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُس وقت براہِ راست اللہ تعالیٰ فعل پیدا فرما دیتے ہیں۔ جیسے سبب اور مسبب میں ہم نے دیکھا کہ آگ کا پیدا ہونا الگ واقعہ ہے اور حرارت کا پیدا ہونا الگ اور دونوں کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے ارادے سے مستقل طور پر پیدا فرما رہے ہیں۔ یہاں بھی پہلے جزوی ارادہ پیدا ہوا پھر میری قدرت متوجہ ہوئی اور یہ توجہ بھی اللہ ہی کے فعل سے ہوئی؛ اور قدرت کے نتیجے میں جو عمل وجود میں آیا وہ بھی میری قدرت سے نہیں بلکہ براہِ راست اللہ کی قدرت سے پیدا ہوا۔

البتہ میری قدرت کا اس عمل سے ایک تعلق ضرور ہے اگرچہ وہ تاثیر کا تعلق نہیں؛ کیونکہ کائنات میں مؤثر حقیقی صرف اللہ ہے۔ اگر میں یہ مان لوں کہ قلم اٹھانے میں میری قدرت نے بھی تاثیر رکھی تو گویا میں نے مؤثر حقیقی کے سوا کسی اور کی تاثیر بھی تسلیم کر لی؛ حالانکہ عقیدہ یہی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی فاعل حقیقی و مؤثر حقیقی ہے اُس کے سوا کوئی مؤثر نہیں۔ لہذا کسی غیر کی تاثیر سے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو پھر میری قدرت کا اس عمل سے کیا تعلق ہے؟ اشاعرہ کہتے ہیں کہ یہ تعلق تاثیر کا نہیں بلکہ ایک اور ہی نوع کا تعلق ہے۔ جیسے علم کا تعلق معلوم سے ہوتا ہے مگر علم معلوم میں کوئی تاثیر نہیں رکھتا اس سے تو صرف انکشاف ہوتا ہے۔ سو معلوم ہوا کہ تعلق بھی غیر تاثیر ہی ہو سکتا ہے جیسے علم کا تعلق معلوم سے۔ اسی طرح صفت قدرت کا مقدور اور فعل سے جو غیر تاثیر تعلق ہے اسے ”تعلق کسب“ کہتے ہیں۔ یہ ”کسب“ ہے یعنی انسان نے اسے کمایا؛ یہ اُس کی قدرت سے پیدا ہونے والی چیز نہیں۔

یہی وہ نظریہ ہے جسے ”کسبِ اشعری“ کہتے ہیں۔ امام اشعری رحمہ اللہ نے کسب کا جو تصور بیان کیا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نہایت غامض اور دشوار مسئلہ ہے۔ اس پر طعن کی وجہ یہ ہے کہ سائل پوچھتا ہے: یہ کیسی قدرت ہے جو کوئی تاثیر نہیں رکھتی؟ قدرت تو موجود ہے مگر تاثیر صرف اُس قدرت کی ہے جس سے فعل پیدا ہوا (یعنی قدرتِ الہی)۔ تاہم پھر بھی ایک نوع کا تعلق ضرور موجود ہے جس کی بنا پر انسان کی طرف اُس عمل کی نسبت ہو جاتی ہے وہ فاعل بن جاتا ہے اور ”کاسب“ کہلاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (البقرة: ۲۸۶)

”اس (جان) کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر وہ (وبال) ہے جو اس نے کمایا۔“

خلاصہ یہ کہ میرے اندر جو جزوی ارادہ پیدا ہوا وہ بھی اللہ کی براہ راست تخلیق ہے پھر قدرت بھی؛ اور قدرت سے جو چیز پیدا ہو رہی ہے وہ میری قدرت سے نہیں بلکہ براہ راست اللہ کی قدرت سے ہو رہی ہے۔ البتہ قدرت کا اپنے مقدور سے ایک غیر تاثیر تعلقی ضرور ہے، اور اسی کا نام ”کسب“ ہے۔ جمہور اہل سنت کا یہی مسلک ہے؛ یعنی اشاعرہ ہی جمہور ہیں اس لیے کہ مالکی اور شوافع عموماً اشعری ہوتے ہیں؛ اور ماتریدیہ میں سے بھی بہت سے لوگوں نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

## ماتریدیہ کا مذہب

ماتریدیہ میں ایک دوسرا موقف بھی ہے جسے بعض اشعری اکابر معتزلی موقف یا اس سے قریب قرار دیتے ہیں۔ تاہم اس سے بات کچھ سمجھ میں آ جاتی ہے اور عقیدہ تقدیر کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے؛ کیونکہ خالص اشعری مسلک میں یہ سمجھنا خاصا دشوار ہے کہ جب سب کچھ ارادہ جزوی قدرت اور قدرت سے پیدا ہونے والا عمل سب اللہ ہی کی تاثیر سے ہو رہا ہے تو انسان بیچ میں محض ”کاسب“ کہاں رہ گیا؟ اور اسے اختیار کہاں حاصل ہوا! علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے ”شرح المقاصد“ میں اس سوال کا مختصر جواب دیا ہے کہ یہ اختیاری عمل پھر بھی انسان کا کیوں کہلاتا ہے! اس لیے کہ اللہ کا علم اور ارادہ یہ ہے کہ انسان یہ فعل ارادے سے کرے گا؛ چنانچہ اس کے اندر ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ درمیان میں انسان کا ارادہ بطور واسطہ موجود ہے؛ اور وہ وجدانی طور پر بھی جانتا ہے کہ میں ارادے سے کر رہا ہوں؛ اسی واسطہ ارادہ کی بنا پر یہ فعل ”اختیاری“ کہلاتا ہے، ”اضطراری“ نہیں؛ اور اسی بنیاد پر انسان جواب دہ ٹھہرتا ہے۔ باقی اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ہمارا کوئی بھگڑا نہیں؛ سب چیزیں اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ سمجھ لیجیے۔ اگر کوئی کہے کہ چلو معتزلہ کی بات مان لیتے ہیں کہ انسان خود ارادہ کرتا ہے قدرت اُسی کی ہے اور وہ خود عمل پیدا کرتا ہے تب بھی اللہ سے سوال باقی رہ جائے گا۔ اس مقام پر آپ سوال سے بیچ نکلیں گے مگر آگے چل کر یہ سوال کھڑا ہوگا کہ اللہ نے مجھے فلاں صلاحیت کیوں نہ دی! میرا قد اتنا کیوں رکھا؟ مجھے فلاں گھرانے ہی میں کیوں پیدا کیا؟ میری ذہنی صلاحیت فلاں کے برابر کیوں نہیں؟ غرض کہیں نہ کہیں پہنچ کر اللہ ہی سے ”کیوں“ کا سوال کرنا پڑے گا۔ اصل قاعدہ جس پر عمل کرنا ہے یہ ہے کہ مخلوق جو عدم سے وجود میں لائی گئی اسے یہ حق نہیں کہ خالق سے پوچھے: تُو نے ایسا کیوں کیا؟

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ ۝﴾ (الانبیاء)

”اس سے اس کے افعال کے بارے میں سوال نہیں کیا جاسکتا جب کہ اُن (سب) سے سوال کیا جائے گا۔“ سو اگر آپ نے خالق سے سوال ہی کرنا ہے تو معتزلی بن کر بھی کہیں نہ کہیں پہنچ کر وہی سوال شروع کر دیں گے۔ بالآخر بات یہیں آٹھہرے گی کہ ”اچھا“ میں اپنے ارادے سے جہنم میں گیا، مگر تجھے تو پہلے سے علم تھا؛ تُو مجھے وجود ہی نہ دیتا تو میں جہنم میں نہ جاتا۔“ اسی لیے فرمایا: ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ ۝﴾ (الانبیاء)

غرض اصل بات یہ ہے کہ ارادہ صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ہے؛ لہذا توکل اور اعتماد بھی اُسی پر ہے؛ اور اللہ کے کسی

فعل پر ”کیوں“ کا سوال روا نہیں۔ ”لَا يَسْأَلُ“ اور ”أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ“ کا تقاضا یہی ہے۔ انسانی وجود اور عقل اتنی محدود ہے کہ وہ خالق کے افعال میں پوشیدہ حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہذا سر تسلیم خم کرنا دین کا پہلا مطالبہ ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۖ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝۲۵﴾ (لقمن)

”اور جو شخص نیکو کار ہوتے ہوئے اپنا رخ اللہ کے سامنے جھکا دے اس نے مضبوط کڑا تھام لیا۔ اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“

ورنہ اس کا ذہن اسے کہیں چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ سب سے پہلا ایمان ”ایمان بالغیب“ ہے، یعنی بن دیکھے ماننا اور پھر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا: ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرة: ۲)

## ارادہ جزوی حال ہے

اب یہ جو ماترید یہ کا امتیازی موقف ہے، اسے سمجھ لیجیے۔ ماترید یہ ہمارے احناف ہیں اور یہ بھی اہل سنت ہی کا ایک گروہ ہے۔ یہ بھی اشاعرہ کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں کہ انسان اپنے اعمال کا خالق نہیں، بلکہ اللہ ہی اعمال پیدا فرماتا ہے؛ انسان کی قدرت بھی اللہ کی مخلوق ہے اور اس کا ارادہ بھی۔ ارادے کی دو قسمیں ہیں: ایک کُلّی ارادہ، یعنی صلاحیتِ ارادہ (مصدری معنی) اور دوسرا جزوی ارادہ، یعنی کسی خاص چیز کا ارادہ کرنا (حاصل بالمصدر)۔ اشاعرہ نے کہا کہ کُلّی اور جزوی دونوں اللہ کی براہِ راست مخلوق ہیں۔ یہیں ماترید یہ نے اختلاف کیا اور کہا کہ صلاحیتِ ارادہ تو بے شک اللہ نے انسان کے اندر رکھی اور اسی نے پیدا کی، لیکن اس صلاحیت کے نتیجے میں یہ ارادہ جو کبھی ادھر متوجہ ہوتا ہے کبھی اُدھر اسے کُلّی ارادے کا ”حال“ کہتے ہیں۔

”احوال“ بعض متکلمین کے نزدیک وجود اور عدم کے درمیان کی ایک کیفیت ہیں۔ نہ انہیں سرے سے موجود کہا جاسکتا ہے نہ بالکل معدوم؛ یہ ایک ”حالی کیفیت“ ہے۔ اصل وجود تو ارادے کی صلاحیت کا تھا؛ اس صلاحیت کا ادھر یا اُدھر متوجہ ہونا اُس ارادے کا ”حال“ ہے، جو اتنی ضعیف چیز ہے کہ گویا موجود ہی نہیں۔ اسی لیے ماترید یہ کہتے ہیں کہ اس جزوی ارادے کا خالق اللہ نہیں، بلکہ خود انسان ہے (کیونکہ یہ جزوی ارادہ حقیقی وجود نہیں رکھتا اور محض ایک اعتبار ہے)۔ یعنی صلاحیتِ ارادہ تو اللہ نے عطا کی؛ اب اگر میرے سامنے دو چیزیں ہیں دودھ اور شراب تو مجھے صلاحیت حاصل ہے کہ دونوں میں سے جسے چاہوں اٹھا لوں، یہ صلاحیت اللہ ہی نے مجھ میں رکھی۔ اب میں اپنی اس صلاحیتِ ارادہ کو دودھ کی طرف متوجہ کروں یا شراب کی طرف، یہی متوجہ کرنا ”جزوی ارادہ“ ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس پر انسان کو اختیار حاصل ہے۔ ماترید یہ کے نزدیک یہ جزوی ارادہ اللہ کی براہِ راست تخلیق نہیں، بلکہ بالواسطہ ہے؛ چونکہ اصل صلاحیتِ ارادہ اللہ نے عطا کی اسی کے نتیجے میں یہ جزوی ارادہ پیدا ہوا، لہذا بالواسطہ تخلیق تو اللہ ہی کی ہے، مگر براہِ راست نہیں، جیسا کہ اشاعرہ مانتے ہیں۔



## ماتریدی موقف: عوام کے لیے زیادہ قابل فہم

یوں یہاں انسان کو ایک آزادی ارادہ حاصل ہو جاتی ہے کہ اپنے ارادے کو ادھر یا اُدھر برتنے کا اختیار اسے حاصل ہے۔ البتہ جب وہ اختیار کرتا ہے تو اُس فعل کا صدور اس کے ارادے یا قدرت سے نہیں ہوتا، بلکہ وہ بھی براہ راست اللہ ہی کی تخلیق ہوتا ہے۔ سو ماتریدیہ نے بھی سب کچھ اللہ کی مخلوق مانا، مگر بیچ میں انسان کے اندر یہ جو جزوی ارادہ تسلیم کیا، اس کی بنا پر تفہیم کچھ آسان ہو جاتی ہے اور انسان کو کچھ گنجائش مل جاتی ہے۔ واقعی اگر اسے بنیاد بنایا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان جواب دہ کیوں ہے۔ اس نے اپنے اسی جزوی ارادے کو شراب کی طرف حرکت دی، جس پر اسے صلاحیت حاصل تھی۔ شراب پکڑنے اور پینے کا فعل اگرچہ براہ راست اللہ ہی کی مخلوق تھا، مگر وہ اسی جزوی ارادے کے سبب مخلوق ہوا؛ لہذا قیامت کے دن انسان اپنے اسی جزوی ارادے پر گرفت میں آئے گا۔

یہ ماتریدی موقف ہے۔ البتہ خود بہت سے ماتریدی علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور اشاعرہ نے اس کی تردید کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ علامہ مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ خود ماتریدی تھے، مگر اس مسئلے میں انہوں نے ماتریدی رائے سے اختلاف کیا اور اشعری مسلک کو ترجیح دی۔ انہوں نے اس کی کئی وجوہ بیان کیں، اور کہا کہ اگرچہ میں ماتریدی ہوں، تاہم یہ مسلک قبول نہیں کرتا۔ اگر کسی کو خالص اشعری مسلک سمجھ نہ آ رہا ہو اور وہ یہ سوال کرے کہ جب ہر چیز براہ راست اللہ کی تخلیق ہے تو انسان جواب دہ کہاں ہوا، تو ماتریدی مسلک میں اسے کچھ گنجائش مل جاتی ہے کہ انسان کے اندر پیدا ہونے والے اسی جزوی ارادے پر اس کی گرفت ہوگی۔ باقی اشکال بہر حال باقی رہتا ہے کہ یہ جزوی ارادہ خود کن عوامل کے تحت پیدا ہوا اور اُن پر انسان کا کتنا اختیار ہے۔ سو چوتھے پانچویں مرحلے پر پہنچ کر ماتریدی علماء کو بھی بالآخر یہی کہنا پڑتا ہے: ”لَا يُسْتَلْ عَمَّا يَفْعَلُ“ اس لیے کہ اس بات سے تو انکار نہیں کہ اللہ جسے توفیق دیتا ہے، وہ ہدایت پاتا ہے، اور جسے چھوڑ کر اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے، وہ محروم رہ جاتا ہے۔ اسی لیے دعائیں مانگا جاتا ہے:

اللَّهُمَّ رَحْمَتَكَ أَزْجُو فَلَا تَكْلِبْنِي إِلَى نَفْسِي طُوفَةً عَيْنٍ، وَ أَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ

(سنن ابی داود)

”اے اللہ! میں تیری ہی رحمت کا امیدوار ہوں، سو مجھے پلک جھپکنے کے برابر بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر“

اور میرا سارا معاملہ سنوار دے؛ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔“

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو ہدایت دے دی اور فلاں کو اس کے نفس کے حوالے کر دیا، ایسا کیوں ہوا؟ جزوی ارادہ اگرچہ میرا ہے، مگر اُس جزوی ارادے پر جو عوامل اثر انداز ہو رہے ہیں، وہ تو اللہ کی رحمت، توفیق اور اذن ہیں۔ اللہ نے میرے لیے نیکی کی راہ آسان کر دی، تو میرے یہ جزوی ارادے بھی پیدا ہو گئے۔ تو یہ سب اسباب کسی کے حق میں کیوں ہوئے اور کسی کے حق میں کیوں نہیں؟ آخر کار وہ بھی یہی کہیں گے: ”لَا يُسْتَلْ عَمَّا يَفْعَلُ“ سو یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر مسلک کا آخری سہارا یہی کلمہ ہے۔ خواہ آپ پہلے مرحلے پر پہنچ نکلیں، آگے پیچھے کہیں نہ کہیں پہنچ کر آپ کو یہی کہنا پڑے گا: ”لَا يُسْتَلْ عَمَّا يَفْعَلُ“

## ابن تیمیہ، ابن قیم اور امام الحرمین کی رائے

اسی سے قریب وہ مسلک ہے جو ابن تیمیہ، ابن قیم اور امام الحرمین ابوالمعالی الجوبینی رحمہم اللہ نے اختیار کیا۔ اس مسلک میں کئی باریوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خالق ہے اگرچہ وہ لفظ ”خالق“ استعمال نہیں کرتے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ اور ضخیم کتاب لکھی ہے: ”شفاء العلیل فی مسائل القضاء و القدر و الحکمة و التعلیل“۔ جن اہل علم نے اسے پڑھا اور اس پر تبصرے کیے وہ بتاتے ہیں کہ ابن قیم رحمہ اللہ کے اقوال کچھ مضطرب اور باہم تناقض ہیں۔ کہیں وہ واضح طور پر اشعری مسلک کا اثبات کرتے ہیں اور کہیں معتزلی معلوم ہوتے ہیں؛ یعنی کتاب میں کچھ ابہام ضرور ہے۔ اسی لیے علماء کہتے ہیں کہ بہت سے مقامات پر تو وہ اشعری مسلک ہی رکھتے ہیں البتہ بعض مقامات پر انہوں نے امام الحرمین ابوالمعالی الجوبینی رحمہ اللہ کی کتاب ”النظامیة“ سے کچھ حوالے دیے ہیں اور امام صاحب کا مسلک چونکہ مشہور ہے اور ابن قیم اس پر بغیر رد کے گزر گئے بلکہ اسے قبول کیا اس لیے بعض نے استدلال کیا کہ ابن قیم کا بھی وہی مسلک تھا جو ابوالمعالی الجوبینی کا تھا۔

وہ مسلک قریب قریب معتزلہ ہی کا تھا۔ اسی لیے امام الحرمین کے اس مسلک کو بعد میں کسی متکلم نے اختیار نہیں کیا بلکہ یوں کہہ کر گزر جاتے ہیں: ”وَيُزَوَّى عَنْ إِمَامِ الْحَرَمَيْنِ“ کہ امام الحرمین سے کچھ ایسا روایت کیا جاتا ہے اگرچہ ہم اسے قبول نہیں کرتے اور وہ تقریباً معتزلہ کا مسلک ہے۔ البتہ یہ حضرات ”خلق اعمال“ کا لفظ استعمال نہیں کرتے بلکہ کئی بار ”احداث“ اور ”ایجاد“ وغیرہ کہتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو قدرت اور ارادہ عطا کیا یہ اللہ کی تخلیق ہے۔ پھر انسان اپنی اسی قدرت اور ارادے سے (ماتریدیہ کے جزوی ارادے کی طرح) ارادہ بھی کرتا ہے اور اعمال بھی اور اسی کی قدرت سے اعمال پیدا ہوتے ہیں یعنی وہ براہ راست اللہ کی تاثیر سے نہیں ہوتے۔ یہ سب کچھ پھر بھی اللہ کی مخلوق اس لیے ہے کہ خود انسان اللہ کی مخلوق ہے؛ چنانچہ بالواسطہ انسان کے تمام ارادے اور اعمال اللہ ہی کی مخلوق ٹھہرتے ہیں۔ فی الاصل یہ معتزلہ کا مسلک ہے مگر امام الحرمین رحمہم اللہ کی بعض عبارتوں سے اس نوع کے مفہیم پیدا ہوتے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمہم اللہ کے بارے میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلے میں ماتریدی مسلک ہی پر ہیں جس میں انسان کو بہر حال ایک ارادہ اور اختیار دیا گیا ہے۔

## ”لَا يُسْتَلْ عَمَّا يَفْعَلُ“ ہی آخری سہارا

تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر مسلک کا آخری سہارا وہی کلمہ ہے: ”لَا يُسْتَلْ عَمَّا يَفْعَلُ“۔ اشاعرہ تو پہلے ہی مرحلے پر کہہ دیتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی مخلوق ہے اور جو حضرات یہ نہیں کہتے اور بالواسطہ تخلیق کے قائل ہیں وہ بھی اللہ کی توفیق اعانت اور احسان کے قائل ہیں کہ اللہ ہدایت دیتا ہے اور آسانیاں پیدا فرماتا ہے جب کہ کسی کے لیے یہ آسانیاں پیدا نہیں فرما رہا ہوتا:

﴿مَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا

”سوال اللہ جسے ہدایت دینا چاہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان میں چڑھ رہا ہو۔“

یہ سب حضرات اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ جب ان سے پوچھا جاتا ہے اور ابن قیم رحمہ اللہ بھی اپنی کتاب میں گویا ہاتھ اٹھا کر یہی کہتے ہیں کہ اللہ نے فلاں کی اعانت فرمائی تو وہ ہدایت پر آگیا، اور فلاں کی نہ فرمائی تو وہ محروم رہا، ایسا کیوں ہوا؟ تو خواہ وہ انسان کو اپنے اعمال کا خالق مانیں بالآخر یہی فرماتے ہیں: ”لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ“۔ لہذا یہ بات ذہن نشین رہے کہ آپ جہاں بھی کھڑے ہوں بالآخر آپ کو یہی ماننا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ خالق ہے، ہر چیز سے واقف ہے، العلیم ہے، الحکیم ہے، لہذا تم اس کی حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ سو خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہی دین ہے: ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾ (الانبیاء)

یہ تمام مسالک نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، کیونکہ بلا مبالغہ اس مسئلے پر ہزاروں صفحات پر مشتمل علمی ذخیرہ موجود ہے۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ یہ کتنا نازک اور محیر العقول مسئلہ ہے، جس پر علماء نے بھی گفتگو کی اور فلاسفہ نے بھی۔ ہر ایک اسی بحث میں مصروف رہا کہ انسان کو کتنا ارادہ اور کتنی آزادی حاصل ہے اور آیا اسے اختیار آزاد حاصل ہے بھی یا نہیں!

## ابن عربیؒ کا مسلک

آخر میں ابن عربی رحمہ اللہ کا مسلک رہ جاتا ہے (یہ اس مسلک کا ایک سطحی بیان ہے۔ اس موقف میں یقیناً بہت گہرائیاں اور باریکیاں ہیں جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں)۔ اس مسلک سے مسئلہ قدر تو حل ہو جاتا ہے، مگر چونکہ یہ مسلک بیشتر متکلمین کے نزدیک قابل قبول نہیں، اس لیے اسے حل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ انہوں نے اسے ”فصوص الحکم“ میں بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ”اعیان ثابتہ“ کا ایک تصور ہے۔ مخلوقات کی جو مابیتیں ہیں جنہیں وہ ”استعدادات“ کہتے ہیں ان کے نزدیک وہ ”غیر مجعولہ“ ہیں، یعنی وہ ذاتی ہیں، انہیں کسی نے بنایا نہیں، بس اللہ نے انہیں ازل سے جان لیا ہے۔ یعنی میری ایک ماہیت ہے جس سے میرے اندر ایک استعداد رکھی گئی، آپ کے اندر اس سے مختلف استعداد ہے، اور جانور کے اندر ایک اور؛ یہ سب استعدادات اور ماہیات ان کے نزدیک ”غیر مجعولہ“ ہیں۔ ”غیر مجعولہ“ کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی کے بنانے سے نہیں، بلکہ ذاتی ہیں، اور اللہ نے انہیں اسی طرح جانا ہے۔ یہ اعیان ثابتہ ہمیشہ سے اللہ کے علم میں موجود تھیں، مگر ”مجعولہ“ نہیں، یعنی اللہ کا علم تو ان سے متعلق ہے، مگر ارادہ متعلق نہیں، اللہ کے ارادے سے یہ ایسی نہیں ہوئیں۔

اہل سنت اس کے برخلاف کہتے ہیں کہ اللہ صرف اشیاء کا نہیں ان کی ماہیت کا بھی خالق ہے۔ مگر ابن عربی علیہ الرحمہ کے ہاں ماہیت ”غیر مجعولہ“ ہے؛ اور جب ان مابیتوں پر ”وجود مطلق“ کا فیضان ہوتا ہے تو یہ ساری مابیتیں اپنی اپنی استعداد کے مطابق وجود میں آتی رہتی ہیں۔ جس کے اندر جو استعداد ہے اسی کے مطابق اس سے عمل پیدا ہوتا چلا

جاتا ہے اور استعداد چونکہ ”غیر مجموع“ تھی، یعنی اللہ تعالیٰ کی رکھی ہوئی نہیں بلکہ اشیاء کی ذاتی تھی اس بنا پر (ان کے نزدیک) اللہ سبحانہ و تعالیٰ بس وجود کا فیضان کر رہے ہوتے ہیں۔

اس مسلک پر کئی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مابیتوں کو اللہ کے دائرہ تخلیق سے کیوں نکال دیا؟ اہل سنت تو متفق ہیں کہ ماہیات سمیت ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے، کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس تصور کے باوجود جبر بہر حال باقی رہتا ہے البتہ اب یہ جبر اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ ان مابیتوں کی طرف سے ہے (مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ نے اس پر یہ اعتراض کیا)۔ جو استعداد رکھی گئی تھی، عمل بھی اسی کے موافق پیدا ہونا تھا، اور اس میں بھی کسی کو اختیار حاصل نہ تھا۔ جیسی ماہیت تھی، ویسا ہی عمل ہوگا۔

یہ ماہیت غیر مجموعہ جب ”وجود مطلق“ کے فیضان سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اعمال کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں، تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ بس انہیں وجود دے رہے ہوتے ہیں اور ایک وجود کا فیضان ہوتا ہے۔ ان اعیان ثابتہ کو ایک ظلی اور وہی قسم کا وجود حاصل ہو جاتا ہے، جو دراصل وجود ہوتا ہی نہیں۔ اسی لیے وہ کہیں کہتے ہیں کہ اعیان ثابتہ وجود میں آگئیں، اور کہیں کہتے ہیں کہ اعیان ثابتہ نے وجود کی بوتل نہ سونگھی، وہ تو عدم ہی میں ہیں۔ بہر حال وہ وجود خواہ ظلی ہو، وہی ہو یا عادی یہ سب مباحث وحدت الوجود سے متعلق ہیں، اور اس میں بہت سی گہرائیاں ہیں جو ابھی ہمارا موضوع نہیں اور میں اپنے آپ کو اس پر تبصرے کا اہل نہیں سمجھتا۔ البتہ اس وقت جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں، یہ مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ کی تحقیق ہے، جنہوں نے ابن عربی علیہ الرحمہ کو پڑھا اور اس پر کلام کیا۔ ابن عربی علیہ الرحمہ نے اپنے اس موقف پر بعض آیات سے استدلال بھی کیا ہے، مگر عربی زبان کے اعتبار سے اس استدلال میں جو لغزشیں ہیں، ان پر متکلمین نے بھی اور مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ نے بھی گرفت کی ہے۔

## عوام کا مسلک

یہ تھا ان مسالک کا مختصر احاطہ جو اس مسئلے پر رہے ہیں۔ اہل سنت کے دو مسلک ہمارے سامنے آئے: اشاعہ اور ماتریدیہ؛ پھر ابن قیم اور امام الحرمین کا مسلک، جو معتزلہ کے کچھ قریب ہے؛ اور پھر ابن عربی علیہ الرحمہ کا مسلک ہے۔ اب اگر آپ پوچھیں کہ ہم عوام کا مسلک کیا ہے، تو ہمارا بس وہی مسلک ہے جو اہل سنت کا متفقہ موقف ہے: ہر چیز کا خالق اللہ ہے اور ہر چیز اُسی کے ارادے کے تحت ہے۔ جو کچھ اللہ نے اپنی مشیت سے لکھ دیا، وہ اسی طرح ہو کر رہے گا، اس کے خلاف کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی؛ اور جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ کی حدیث میں گزرا، اسی پر ایمان رکھنا ہے۔ باقی یہ سارے مسالک محض تدریس کی غرض سے مختصر بیان کیے گئے ہیں۔

آخری بات یہ کہ اس مسئلے کو اپنے غور و فکر کا موضوع نہ بنائیے، بلکہ اسے اپنے ”حال“ کا موضوع بنائیے؛ یعنی عقیدہ تقدیر کو محض ”قال“ (زبانی بحث) بنانے کے بجائے اسے اپنا حال بنانے کی کوشش کیجیے؛ کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے اس میں قیل وقال سے منع فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح بات ہے، وہ ہمارے دلوں میں اتار دے۔ آمین!



## مبادی علم کلام<sup>(۵)</sup>

سعید عبداللطیف فودہ

ترجمہ: مکرم محمود

### امام اشعریؒ اور حنابلہ مائل تجسیم

اس مرحلہ میں رسوخ حاصل کرنے کے بعد جب آپ کی توجہ معتزلہ کے محاذ سے ذرا کم ہوئی تو آپ کا سامنا بعض حنابلہ سے ہوا جن میں غلو اس حد تک پایا جاتا تھا کہ وہ تجسیم کے عقیدہ کے قریب قریب پہنچے ہوئے تھے بلکہ بہت سے تو اس کے قائل ہی ہو گئے تھے۔ آپ کی ملاقات حنابلہ کے ایک شیخ حافظ زکریا الساجی سے بھی ہوئی جن کے ذریعے آپ کو حنابلہ کے بہت سے عقائد کا علم ہوا۔ انہی باتوں کے زیر اثر آپ نے کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ لکھی۔ امام زاہد الکوثری فرماتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے امام صاحب نے یہ کاوش فرمائی کہ حنابلہ کو تدریج کے ساتھ تجسیم سے تنزیہ تک لے آئیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جب آپ نے حنابلہ کے عقائد میں تجسیم کی ملاوٹ دیکھی تو اس کے بعد یہ کتاب تالیف فرمائی تاکہ حنابلہ کے عقائد کو تجسیم سے پاک کر سکیں۔ اس کے بعد بھی آپ نے بہت سی تالیفات فرمائیں مثلاً کتاب الملع اور رسالۃ الی اہل الثغر وغیرہ۔ بہت سے تلامذہ نے آپ سے عقائد اسلام کا فہم حاصل کیا اور ان کے دفاع کے طریقے اور اہل تشکیک کے شکوک کا دور کرنا سیکھا۔ یہ معاملہ ۲۰ سال تک جاری رہا یہاں تک کہ آپ کی وفات کا وقت آگیا۔

جس عقیدہ کی آپ نے توضیح و تنقیح فرمائی، یہ وہی ہے جس کے حامل آپ کے تلامذہ بنے اور پھر ان کے تلامذہ مثلاً قاضی باقلانی، امام غزالی، امام الحرمین الجوبینی اور ان سے پہلے بندار، ابوالحسن الباہلی، ابوبکر القفال الشاشی وغیرہ اور اس کے علاوہ کثرت سے نام لیے جاسکتے ہیں۔

### دوسرے دور سے رجوع کا فرضی قصہ

عقیدہ کے محافظوں کا یہ سلسلہ اس زمانے تک جاری ہے۔ شیخ کو سب سے بہتر ان کے تلامذہ ہی نے سمجھا ہے۔ یہ بات ناممکن ہے کہ ان کے تلامذہ اور دوسرے لوگوں نے یہ سارا زمانہ ان کے ساتھ گزارا ہو اور ان کا گمان یہ ہو کہ ہم نے شیخ اشعریؒ کو سمجھا ہے لیکن درحقیقت ان سب نے نہ سمجھا ہو۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا کہ آپ نے اپنے دور ثانی میں اپنے تلامذہ کو جو عقائد سکھائے تھے ان سے آپ نے رجوع کر لیا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو ظاہر ہے کہ

ان کے قریبی لوگ ہی اس بات کو سب سے پہلے جانتے، لیکن ان میں سے کسی کی طرف سے کوئی ایک حالی یا قاتلی اشارہ بھی اس بات کی طرف نہیں ملتا۔

اس بات کی توضیح میں اتنی طوالت کی حاجت نہ ہوتی اگر بعض لوگ جن پر جہالت سوار ہے اور وہ جہالت میں کانوں تک ڈوبے ہوئے ہیں، یہ بات نہ کرتے کہ آخری عمر میں امام اشعری نے اپنے ان عقائد سے رجوع کر لیا تھا جن کو ثابت کرنے میں آپ نے برسوں لگائے۔ آپ کے تابعین اور تلامذہ کو اس بات کا علم ہی نہ ہو سکا، یا اگر ہوا تو انہوں نے اس رجوع کو قبول نہیں کیا اور وہ ان کے انہی عقائد پر جمے رہے جو رجوع سے پہلے کے تھے۔ اب جو بھی اپنا انتساب امام صاحب کی طرف کرتے ہیں اس زمانے کے یا پچھلے زمانوں کے، ان سب کا انتساب امام صاحب کی طرف درست نہیں۔ وہ ”حقیقی“ امام اشعری کی پیروی نہیں کرتے۔ اس طرح کی باتیں یہ حضرات کرتے ہیں۔ جب ہم یہ بات جان چکے ہیں کہ جمہور علماء اُمت عقائد کے معاملات میں ان امام اشعری کے متبع ہیں جن کے بارے میں ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ آخر عمر میں آپ اصل اہل سنت کے عقائد کی طرف آ گئے تھے۔ نتیجہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ اُمت کے جمہور علماء عقائد کے معاملے میں گمراہ ہو گئے اور ہدایت پر نہ رہے۔ ہدایت اور توفیق جن کے شامل حال ہوئی، وہ تو چند ایک ہی تھے۔ ہماری اس بات پر قاری یقیناً حیران ہوگا کہ امام اشعری جیسے عظیم امام نے اس عقیدہ سے جس پر ان کی عمر کا آخری آدھا حصہ گزرا ہے، کیسے رجوع کر لیا، اور اس رجوع کی کسی کو خبر تک نہ ہوئی! اس رجوع کی خبر کیوں نہ پھیل سکی جبکہ آپ کے مذہبِ اعتزال کو چھوڑنے کی خبر سب کو ہوئی؟ یہ تو ایک معجزہ ہوگا (کہ رجوع بھی کیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی)۔ ہم قاری کو مقامِ حیرت ہی میں نہیں چھوڑیں گے بلکہ اس مسئلہ کی وضاحت اس مقام کی مناسبت سے ابھی کرتے ہیں۔ اس بات کا وعدہ رہا کہ اس موضوع پر مستقل اور مفصل کلام کسی اور جگہ پر کریں گے کیونکہ اس موضوع کو آج کل بہت سے لوگ اٹھاتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اکابر علماء دین کے عقیدہ سے امام اشعری کی مراجعت والے قصے کی اشاعت اصل میں مجسمہ ہی کا کام ہے۔ انہوں نے اس بات کو پھیلانے کے لیے اپنے تمام مسائل اور طاقت کو صرف کیا ہے تاکہ لوگوں کو اس عقیدہ سے برگشتہ کر سکیں جو ان کے افکار اور ان کے عقیدے کے بُت، جن کو وہ پوجتے ہیں، کے لیے ضربِ قاطع ہے۔

تمام لوگوں نے امام احمدؒ کے کچھ مخصوص پیروکاروں کے سخت تعصب اور تنگی افکار کو جان لیا ہے۔ جو بھی فہم یا دفاعِ دین کے لیے عقل کے استعمال کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف ان اصحاب کے اعلانِ جنگ کی بات بھی اب بالکل ظاہر ہو گئی ہے۔ ان کو اس حالت تک پہنچانے کی بڑی وجہ معتزلہ کے تسلط کا فتنہ تھا۔ اس معاملہ نے ان کے نفوس پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ امام احمد کے کلام کو بذاتِ خود ایسی جت سمجھنے لگے کہ جس سے اختلاف کرنا کسی صورت ممکن ہی نہ ہو۔ فتنہ اعتزال سے نفور اور غور و فکر سے اعراض نے انہیں مجسمہ کے بے بنیاد افکار کا شکار بنا دیا۔ ان میں تجسیم کے جراثیم اس حد تک پھیل گئے کہ بعض تو مجسمہ کے ائمہ قرار پائے۔ وہی تجسیم ان کا مذہب بن گئی جس کا وہ

دفاع کیا کرتے تھے اور اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ حق بات یہی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ وہ اپنے ان عقائد مثلاً جہت، حد، حرکت، حجم، اعضاء، مس کرنا (ان سب کو خدا کے لیے ثابت کرنا) اور اس طرح کچھ بڑی بڑی باتوں پر ضعیف اور موضوع احادیث بلکہ ہر قول فاسد سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ اپنے ان فاسد عقائد پر لڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ البتہ ان میں اور اصحابِ تنزیہ یعنی شافعیہ اور دوسروں میں قتل و قتال کی نوبت کم ہی آئی ہے۔ جب یہ عام لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ جو کر رہے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا قول ہی ہے اور ہر دوسرے قول کو اٹھا کر پھینک دیتے ہیں یہ بالکل وہی بات ہے جو خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہی تھی کہ لاحکم الا للہ۔ حضرت علیؑ نے جواب دیا تھا کہ بات تو درست ہے مگر اس میں جو چاہا جا رہا ہے وہ باطل ہے۔ چنانچہ عام لوگ ان کی ان باتوں سے دھوکے میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ وہ معتزلہ کا بھی رد کرتے ہیں کہ وہ عقلی بحثوں میں پڑ گئے۔ عوام الناس تو ان معاملات کو نہیں سمجھ سکتے (وہ سمجھتے ہیں کہ یہ معتزلہ کا رد کر رہے ہیں لہذا یہی اہل حق ہیں)۔ اسی لیے اس زمانے میں عام لوگوں میں مجسمہ کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے اور (ان کی وجہ سے بھی جو مجسمہ میں نہیں ہیں مگر) جو ان کے ساتھ چلتے ہیں لیکن نہ ان سے بحث کرتے ہیں اور نہ ان کی غلطیوں پر ان کو متنبہ کرتے ہیں۔

جب امام اشعری نے معتزلہ سے مناظرے کیے، ان کے اقوال کو فاسد ثابت کیا اور کلامِ سلف کی نصرت و تائید کی، جیسے پہلے گزر چکا ہے، اور بیک وقت نصوص کے ظواہر کو پکڑے رہنے اور عقل کے استعمال کی بات کی تو ان کے ارد گرد بہت سے مخلص اہل علم جمع ہو گئے اور ان کا نام جیسے اہل سنت کی علامت بن گیا۔ آپ نے اپنی تالیفات کے دوران ہی مجسمہ کا رد بھی کیا اور کہا کہ یہ اہل سنت سے خارج ہیں۔ یہ بات اہل تجسیم کے شیوخ کی امام صاحب سے عداوت کا باعث بنی۔ البتہ آپ کے اقوال اور دلائل کی قوت، صبر اور اپنے اصحاب اور شاگردوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کی وجہ سے آپ ان غلبہ پانے والے مجسمہ کے مراکز کو ہلانے کے قابل ہوئے اور ان کے مقام و مرتبہ کو عام لوگوں میں متزلزل کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ آپ کا طریقہ آپ کی اٹھائی ہوئی بنیادوں پر راسخ ہوتا گیا۔ لوگوں اور علماء کے دلوں میں اس کو رسوخ عطا کرنے میں آپ کے تلامذہ کا بھی بڑا کردار ہے۔ معتزلہ کا خطرہ ٹل گیا اور تجسیم کے مفاسد کم ہو گئے۔ اہل سنت کا مذہب ظاہر ہوا جو اپنی ساخت و صورت میں بالکل واضح اور اپنی اٹھان میں قوی و مضبوط ہے۔ اس طرح معاملہ چلتا رہا۔ آپ کے طریقہ پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ اگر کسی نے تنقید کی بھی تو جزوی اور فروعی مسائل میں کی۔ جہاں تک اصول کی بات ہے تو وہ علمائے اہل سنت کے ہاں راسخ تھے اور وہ ان سے راضی رہے یہاں تک کہ برسوں گزر گئے۔

کم از کم چار سو سال تک کسی نے یہ دعویٰ نہ کیا کہ امام اشعری نے اپنے اس طریقہ سے جو پھیلا یا اور سینکڑوں سال جاری رہا، رجوع کر لیا تھا۔ اگر کسی نے یہ بات کی تھی تو اپنے آپ کو ہی بے وقوف بنایا تھا اور لوگوں کی عقلوں کو



بہت ہلکا جانا تھا۔ اس طرح کے واقعات کو تو بے وقوفوں کے واقعات میں ذکر کرنا چاہیے۔

پھر آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں ابن تیمیہ الحارانی کا ظہور ہوا۔ ان کو اپنے بارے میں کامل ذہانت اور مکمل علم کا گمان تھا۔ آغاز میں آپ کا اشتغال سنت سے دیکھ کر علماء نے آپ کی مدح کی۔ جب آپ کے گھرانے پر باقی گھرانوں کی طرح تاتار نے مصائب نازل کیے تو علماء نے آپ کے ساتھ ہمدردی اور مدد کا معاملہ کیا، تاکہ آپ کے باپ اور دادا کے اچھے نام اور ذکر کی حفاظت بھی ہو سکے۔ وہ دونوں فقہ میں امام احمد کے متبع تھے۔ اس وقت ابن تیمیہ کو خود ایک مقام حاصل نہ ہوا تھا کہ سینے میں پوشیدہ باطل مذہب اور نجسی عقائد کا اعلان کرتے اور ان عجیب و غریب باتوں کو بھی ظاہر کرتے جو آپ نے اہل سنت کے بڑے علماء کے خلاف چھپا رکھی تھیں۔ اس زمانے میں بھی گزشتہ زمانوں کی طرح مذہب اہل سنت یعنی اشاعرہ کا مذہب سب سے آگے تھا۔ ابن تیمیہ ان کے شدید مخالف تھے لیکن اس (اہل سنت اشاعرہ کے مذہب کی مقبولیت) کی وجہ سے واضح طور پر یہ کہہ نہ سکتے تھے کہ امام اشعری عقائد میں صریح غلطی پر ہیں اور اسی طرح ان کے متبع علماء بھی گمراہ اور بدعتی ہیں۔ اس وجہ سے ابن تیمیہ نے اپنے اقوال اور اپنی کتابوں میں بہت سے بالواسطہ طریقے اختیار کیے اور تنزیہ کے مذہب کے انہدام کی کاوش کی۔

اسی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے انہوں نے اپنی طرف سے یہ بات پھیلا دی کہ امام اشعری نے اس عقیدہ سے رجوع کر لیا تھا جس پر اشاعرہ کا مذہب کی ہمیشہ سے بنیاد رہی ہے اور ابن تیمیہ جس عقیدہ کی دعوت دے رہے ہیں یعنی تجسیم کا عقیدہ اس کو امام اشعری نے قبول کر لیا تھا۔ امام اشعری کے متبعین ”حقیقی“ اشعری کی پیروی نہیں کر رہے، وہ اشعری جن کو ابن تیمیہ اور باقی مجسمہ نے اپنے وہم و خیال سے بنایا ہے اور خارج میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ امام اشعری اپنی فکری اور عملی حیات کے تمام مراحل میں تنزیہ کے قائل رہے ہیں اور کبھی عقائد تجسیم کا اظہار نہیں فرمایا۔ اپنی حیات کے آغاز میں آپ معتزلی تھے۔ پھر اہل سنت کے عقائد کی طرف رجوع فرمایا اور اپنے سے پہلے آنے والے متکلمین کے مذہب کی تجدید فرمائی جو کہ سب کے سب تجسیم کے خلاف تھے۔ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں آیا کہ آپ نے کہا ہو، مثلاً کہ: اللہ تعالیٰ کے لیے حدود جہت ہے اور یہ کہ اللہ کی ذات کے ساتھ حوادث کا قائم ہونا بھی ممکن ہے، وغیرہ۔ آپ تو اپنی تمام زندگی ان اقوال کی نفی اور ان کے قائلین کا رد فرماتے رہے۔

اس بات کی اشاعت کا مقصد اصل میں عام لوگوں کو بھی متاثر کرنا تھا تاکہ ان کے دل میں یہ بات بٹھادی جائے کہ امام اشعری نے ابن تیمیہ کے عقیدہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ ابن تیمیہ یہ بات جانتے تھے کہ علماء اسلام تو اس دھوکے میں نہیں آئیں گے، اس بات کے تو عوام ہی قائل ہو سکتے ہیں اور یہی اس نامعقول اشاعت کا مقصد بھی تھا۔ علماء دین نے ابن تیمیہ کی حیات ہی میں ان کے نظریات کے خلاف جدوجہد کی۔ ان سے مناظرہ کیا اور ان کی غلط فہمیوں کو واضح کیا۔ ان پر الزام ثابت کر کے ان کو جیل بھجوا دیا۔ ابن تیمیہ کی وفات جیل ہی میں اپنے فاسد افکار اور بے بنیاد عقائد کے دفاع کرتے ہوئے ہوئی۔



ابن تیمیہ کی وجہ سے جس فتنہ نے جنم لیا تھا اس کے آثار (اہل سنت کی کاوشوں کی وجہ سے) اس زمانہ میں اور بعد میں آنے والے زمانوں میں آہستہ آہستہ زائل ہوتے گئے اور اشاعرہ کو اجتماعی معاملات پر پھر غلبہ حاصل ہو گیا، یہاں تک کہ ہمارا زمانہ آ گیا۔ اس زمانے میں ہم اسلام کے سفید صحیفہ کو داغ دار کرنے کے لیے کالے نقطوں کی طرح ابن تیمیہ کے افکار سے متاثر بہت ہی کم کاوشوں کو پاتے ہیں اور ان کاوشوں نے اپنے زمانوں پر بھی کوئی خاص قابل ذکر اثر نہیں چھوڑا۔

## تجسیم کا فتنہ

یہاں تک کہ یہ مشکل زمانہ آ گیا جب خلافت اسلامی کا خاتمہ کچھ اندرونی اور بیرونی دھوکا بازوں کی وجہ سے ہو گیا۔ مغربی ممالک نے اپنی مادی قوت کے بل بوتے پر مسلم ممالک پر ہجوم کیا اور انہیں مختلف اجزاء میں تقسیم کر دیا، جیسے کھلونوں کو توڑ دیا جاتا ہے۔ ان دشمنوں کو اصل فکر اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کی فکری اور اعتقادی وحدت کو توڑا جائے۔ ہند سے مراکش تک اور یورپ کے بیچ سے افریقہ کے دور دراز علاقوں تک کے مسلمان اس وحدت سے متصف ہیں۔ مذہب تجسیم اور اس سے متعلقہ فکری مواقف کا اسلامی دنیا میں مختلف جگہوں پر ظہور کا اس وقت بہترین موقع تھا۔ انتشار پھیلانے کے لیے سب سے بہتر انتخاب مذہب تجسیم کا ہی ہو سکتا تھا۔ منجملہ اس کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اُس وقت جتنے بھی مذاہب موجود تھے مثلاً اہل سنت، اہل تشیع، زیدی، اباضی، معتزلی، تجسیم، ان سب کے ہی خلاف ہے۔ یہ سب ہی تشبیہ اور تجسیم کے منکر ہیں۔ اس لیے یہ بہت اچھا موقع تھا کہ اس مذہب کو مٹنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے تاکہ یہ اہل اسلام میں تفرقہ بازی میں زیادتی کا باعث بنے۔ اس مذہب کی بڑی شخصیت ابن تیمیہ ہی کی تھی۔ ابن تیمیہ کے متبعین اور ان کی فکر کا ظہور پہلے ”وہابیہ“ کے عنوان سے ہوا۔ پھر کچھ عرصہ بعد بعض علاقوں میں اس نام کو ”سلفیہ“ کے نام سے بدل دیا گیا۔ یہ نام کی تبدیلی بھی اس مصلحت سے تھی کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے۔ خاص طور پر جب انہوں نے اس مذہب کے نام (وہابیہ) پر مسلمانوں کے ساتھ ظلم و بربریت کا معاملہ روا رکھا تھا تو نام کا بدلنا یقیناً لوگوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔

اس طرح ایک باقاعدہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے بعد احوال و معاملات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور عام لوگ اشاعرہ کو جو کہ دین کے حمایتی اور اس کی حفاظت کرنے والے تھے بدعتی کہنے لگے۔ اصل میں تو یہ ایک قدم تھا تاکہ مسلمانوں پر دین کے دشمنوں کے قبضے کو ممکن بنایا جاسکے۔

مذہب تجسیم کو اپنانے کے فساد کے باعث عام و خاص کے نفوس جیسے بے حس ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقلیت کی وہ متحرک روح جس کے مسلمان شروع سے حامل چلے آ رہے تھے اور جو انہیں عقیدہ اسلام کے دفاع پر ابھارتی تھی، سرے سے غائب ہو گئی۔ اہل سنت کا منہج لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا بلکہ وہ اس کو بدعت، گمراہی اور کفر کی ایک شاخ سمجھنے لگے۔ افسوس یہ کہ ابھی بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ مضبوط بنیادیں ہیں جن پر وہ کھڑے ہیں۔ (باقی صفحہ 92 پر)

## مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر انتظام رجوع الی القرآن کورسز ۲۶-۲۰۲۵ء کی تقریب اسناد مرضیٰ احمد اعوان

یہ تقریب ۲۴ جون ۲۰۲۶ء کو دن گیارہ بجے قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت صدر انجمن محترم ڈاکٹر عارف رشید نے کی۔ پارٹ ون کے طالب علم حافظ سید محبوب علی نے سورۃ الکہف کے آخری رکوع سے تلاوت کی اور پھر اس کا ترجمہ بیان کیا۔ کلیۃ القرآن کے طالب علم اسرار احمد نے نعت رسول مقبول ﷺ پیش کی۔ کورسز کے کوآرڈینیٹر محترم سجاد سندھو نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔

استاد محترم حافظ مومن محمود نے ”طالب علم کون ہے؟“ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس حوالے سے نبی اکرم ﷺ نے کثرت سے فضائل بیان کیے ہیں کہ جو علم کی طرف چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ کھول دیتے ہیں جبکہ فرشتے اپنے پروں کو بچھا دیتے ہیں۔ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں کہ ایسا طالب علم وہ ہے کہ جس کے دل و دماغ میں ہر وقت علم کی تڑپ رہتی ہے اور وہ کسی نہ کسی علمی مسئلے کے بارے ہی میں سوچ بچار کرتا رہتا ہے۔ یعنی وہ علم سے کبھی بھی سیر نہیں ہوتا۔ ہمیں علم کو مشغلہ نہیں بنانا چاہیے بلکہ اسے دین کے احیاء کے لیے حاصل کرنا چاہیے۔ عمل اگر علم کے بغیر ہو تو فساد برپا ہوگا۔ موجودہ دور میں سوشل میڈیا کے ذریعے بولنے والے زیادہ ہیں لیکن ان کے علم میں رسوخ کی بجائے سطحیت کا غلبہ ہے۔ علماء کا ادب نہ ہونے کے برابر ہے۔ تمام علوم کو درجہ بدرجہ حاصل کر کے علوم عالیہ کی تحصیل کرنی چاہیے۔ تمام علوم کا مرکز قرآن مجید ہے۔

استاد محترم ڈاکٹر محمد رشید ارشد نے کتاب ”ریاض الصالحین“ کے مقدمہ کا مطالعہ کرواتے ہوئے کہا کہ بندوں کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اصل زندگی دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ دنیا کی لذتوں کے پیچھے بھاگنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہر مکلف کے لیے لازم ہے کہ وہ جنت کو حاصل کرنے کا اہتمام کرے۔ اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کو اپنانا چاہیے۔ آج استاد سے تعلق اور کتاب کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ جس شخص کے علم کا ماخذ سکرین ہے وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

محترم سجاد سندھو نے دونوں کورسز کی سرپیش کی۔ سال اول میں ۳۱ طلبہ نے داخلہ لیا جبکہ ۲۱ نے کورس کی تکمیل کی۔ استاد محترم مفتی ارسلان محمود نے پارٹ ون میں تجوید، حفظ اور فقہ العبادات؛ محترم ڈاکٹر رشید ارشد نے مطالعہ حدیث، اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام؛ محترم فیاض قیوم نے عربی گرامر کی تینوں کتابیں پڑھائیں

جبکہ محترم آصف حمید نے عربی کلاسز کی نگرانی کی۔ محترم ذیشان اشرف نے عربی گرامر کلاس میں معاونت کی۔ محترم مومن محمود نے قرآنی سورتوں کی صرفی و نحوی ترکیب اور ترجمہ محترم محمود حماد نے منتخب نصاب (مکمل) اور سیرت النبی ﷺ محترم حافظ عاطف وحید نے معاشیات اسلام اور محترم ثاقب احمد نے قصص النبیین کی تدریس کی۔ اضافی محاضرات میں مولانا شفیع الرحمان نے ”عقیدہ ختم نبوت“، مفتی سیف اللہ نے ”حیات عیسیٰ علیہ السلام“ اور مولانا سفیان غوری نے ”ختم نبوت کی اہمیت و فضیلت“ پر لیکچرز دیے۔ امیر تنظیم اسلامی محترم شجاع الدین شیخ نے طلبہ سے ملاقات کی اور ان کے سوالوں کے جواب دیے۔

سال دوم میں ۸ طلبہ نے داخلہ لیا تھا جبکہ ۴ نے کورس کی تکمیل کی۔ ڈاکٹر رشید ارشد نے مصطلح الحدیث اور ریاض الصالحین مومن محمود نے عربی کی تفاسیر (تسہیل العلوم)، مفتی ارسلان محمود نے اصول الفقہ، نکاح و طلاق کے مسائل اور کاروبار سے متعلق مسائل و احکام محترم ثاقب احمد نے عربی کا معلم (حصہ سوم و چہارم) اور محترم مکرّم محمود نے الاربعین فی اصول الدین کی تدریس کی۔

سال اول کے سی آر محترم ڈاکٹر فاروق اختر نے کہا کہ آج یادگار لمحات کا دن ہے۔ ہم نے دین کو سمجھنے اور اس کو اپنی زندگی پر نافذ کرنے کی کوشش کی۔ قرآن اور مسنون دعائیں سیکھیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہو سکیں۔ شروع میں یہ علمی سفر مشکل لگ رہا تھا لیکن اساتذہ نے بہتر راہنمائی کی۔ علم بڑی نعمت ہے لیکن اصل کامیابی اس پر عمل کرنے سے ہے۔ یہ سب ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

سال دوم کے طالب علم محترم سہیل احمد نے کہا کہ اساتذہ کے سامنے بیٹھنے سے ہمیں اپنی جہالت کا احساس ہوا۔ دنیا و آخرت میں کامیابی کا راز قرآن و سنت پر عمل کرنے سے ہے۔ قرآن اکیڈمی میں ہمیں بہتر ماحول میسر آیا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر اسرار احمد کی قبر کو نور سے منور فرمائے جنہوں نے اس ادارے کی داغ بیل ڈالی۔

محترم ڈاکٹر عارف رشید نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ مرکزی انجمن خدام القرآن والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا لگایا ہوا پودا ہے جس کے بطن سے پورے پاکستان میں اکیڈمیز نے جنم لیا۔ الحمد للہ! عملی طور پر دیکھا جائے تو اس علم کو پھیلانے میں کراچی لاہور سے آگے ہے۔ امیر تنظیم اسلامی محترم شجاع الدین شیخ جس طرح اس کام کے لیے اپنی توانائیاں لگا رہے ہیں، وہ قابل ستائش ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مسلسل اس مشن میں لگے رہے تاکہ لوگ قرآن سے جڑ سکیں۔ قرآن اکیڈمی کا یہ خطہ ارضی اس غرض کے لیے ماڈل ٹاؤن میں لیا گیا تھا کیونکہ یہاں سے پنجاب یونیورسٹی قریب تھی۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ نوجوان طلبہ اس کام کے لیے آگے آئیں۔ ان کا نصب العین اقامت دین کی جدوجہد تھی جس کے لیے انہوں نے ”تنظیم اسلامی“ قائم کی۔ مجھے آپ لوگوں پر رشک آتا ہے۔ آپ کے والدین کی بہت بڑی قربانی ہے جن کی دعاؤں کے طفیل آپ نے یہ علم حاصل کیا۔ آپ نے جو علم حاصل کیا، اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوں اور پھر اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے تعلیم و تدریس کا سلسلہ

شروع کریں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جو حاصل کیا ہے وہ ذہن سے محو ہو جائے گا۔

اس کے بعد طلبہ میں اسناد تقسیم کی گئیں۔ سال اول کے طلبہ میں محترم ڈاکٹر عارف رشید جبکہ سال دوم کے طلبہ میں محترم ڈاکٹر ابصار احمد نے اسناد تقسیم کیں۔

ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور محترم حافظ عاطف وحید نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کورسز کا انعقاد بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ان کورسز میں شریک لوگوں نے اپنے قیمتی اوقات ہمیں دیے ہوتے ہیں، لہذا ہماری کوشش ہوتی ہے کہ جو لوگ بھی یہاں سے فارغ ہوں وہ بامقصد علم لے کر جائیں۔ آج ہمیں سب سے پہلے اعلیٰ اور بہترین کلمات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ میں کورس کے اساتذہ کرام کا بہت ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے جذبہ خلوص اور محنت کے ساتھ طلبہ کو پڑھایا۔ مجھے ان پر فخر ہے۔ اساتذہ کی کوئی دنیوی غرض نہیں تھی بلکہ انہوں نے صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے اپنا وقت اور اپنی توانائیاں صرف کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس انفاق کو قبول فرمائے۔ ان کے علم و فضل میں مزید اضافہ فرمائے اور انہیں تاحیات اس ادارے کے ساتھ معاونت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں طلبہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہمیں برداشت کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس انفاق و وقت کو قبول فرمائے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہم سب کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ آخر میں محترم مفتی ارسلان محمود کی دعا پر اس تقریب کا اختتام ہوا۔ اس موقع پر تمام حضرات کے لیے ظہرانے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔



### بقیہ: مبادی علم کلام

وہ جس کو غور و فکر کا سلیقہ نہیں، عقائد پر کتابیں لکھ رہا ہے اور مذاہب پر تنقید کر رہا ہے۔ اس نے اسلام کے عبقری علماء پر فیصلہ صادر کرنے کے لیے اپنے آپ کو بذات خود منصب قضا پر فائز کر لیا ہے اور حکم بن بیٹھا ہے۔ اس سب نے وہ سازگار ماحول فراہم کر دیا ہے کہ مغربی اور مشرقی افکار جو کفریہ علوم سے ملوث ہیں، ان کو مسلمان نوجوان آسانی سے قبول کر لیتے ہیں بلکہ ان کا دفاع کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی حق ہے۔

چند ہی مخلص علماء اور ان کے ہم خیال ہیں جو ابھی تک اسلام کا دفاع اور حق صریح کی شرح و وضاحت کر رہے ہیں۔ البتہ یہ چند افراد اس سیلاب کے آگے بندھ باندھنے پر مکمل قدرت نہیں رکھتے کیونکہ یہ چند لوگوں کا کام نہیں ہے۔

ہم یہاں اپنے کلام کو روکتے ہیں جس پر کچھ خطابی رنگ چڑھ گیا ہے۔ اتنی بات ہی ابھی کے لیے کافی ہے۔ ہماری کوشش بس یہی ہے کہ ہم مسلمانوں اور اللہ کے لیے مخلص لوگوں کو اس عظیم اور ضروری کام (دفاع عقائد حق) کے لیے ابھار سکیں۔



## تعارف و تبصرہ

تبصرہ نگار: احمد علی محمودی

|             |                                             |
|-------------|---------------------------------------------|
| نام کتاب :  | دارالاسلام پٹھان کوٹ                        |
| مؤلف :      | پروفیسر الطاف طاہر اعوان                    |
| اشاعت اول : | مئی 2026ء                                   |
| صفحات :     | 269 صفحات                                   |
| ناشر :      | اسلامک پبلی کیشنز، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور |

فون: 2- (042) 35252501 ای میل: islamicpak@gmail.com

برصغیر کی سیاسی اور فکری تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے چند ایسے مراکز کی یاد آتی ہے جو محض جغرافیائی حدود تک محدود نہیں رہے، بلکہ ایک پورے عہد کے فکر اور تحریک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ ایک ایسا ہی منفرد اور تاریخی ادارہ ہے جس نے ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء سے ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء تک یعنی تقریباً ایک دہائی پر محیط مدت میں برصغیر کی اسلامی فکر و سیاست کو ایک نئی راہ دی۔ زیر نظر کتاب اسی اہم تاریخی دور کی دستاویز ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال کے مشورے اور چودھری نیاز علی خان کی دعوت پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ حیدرآباد دکن سے ہجرت کر کے پٹھان کوٹ (موضع جمال پور) تشریف لائے۔ یہاں انہوں نے ”دارالاسلام“ کی بنیاد رکھی، جو محض ایک دفتر یا ادارہ نہیں تھا، بلکہ ایک مینارۂ نور اور فکری و تحقیقی مرکز تھا، جہاں احیائے اسلام کے لیے ایک منظم لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دارالاسلام علامہ اقبال کے تخیل، چودھری نیاز علی خاں کے ایثار اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے فکری اجتہاد کا ایک حسین امتزاج تھا۔ دارالاسلام ایک مرکز بھی تھا، ایک تصور کی عملی تشکیل بھی اور جماعت اسلامی کی خشت اول بھی۔ اس کا مقصد معاشرے کے افراد کو اسلام کا جامع تصور پیش کرنا اور فکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی معاونت کرنا تھا تاکہ وہ اسلامی تمدن کے احیاء کے لیے بھرپور جدوجہد کر سکیں۔ پھر اس جدوجہد کے نتیجے میں اولاً پاک و ہند اور بعد ازاں پوری دنیا کو دارالاسلام بنایا جاسکے۔

یہ کتاب قاری کو اُس دور میں لے جاتی ہے جب یہ ادارہ جماعت اسلامی کے ارتقا کا گہوارہ بنا، جہاں مولانا

مودودیؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر نہ صرف علمی و تحقیقی کام شروع کیا، بلکہ خطبات اور تحریروں کے ذریعے ایک منظم فکری تحریک کی بنیاد بھی ڈالی۔ یہ وہی دور تھا جب برصغیر میں مسلم قوم پرستی کی لہر اپنے عروج پر تھی اور تقسیم ہند کی تاریخ لکھی جا رہی تھی۔ مؤلف نے اس کتاب میں تقریباً ساڑھے نو سال کے اس اہم عرصے کو قلم بند کیا ہے جو دارالاسلام پٹھان کوٹ کی تاریخ کے ساتھ برصغیر کی اسلامی تحریک کے ابتدائی ایام کا بھی آئینہ دار ہے۔ دارالاسلام کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے صدیوں پر محیط تاریخ کو جس خوبصورتی کے ساتھ چند صفحات میں سمویا گیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ دارالاسلام اور جماعت اسلامی لازم و ملزوم ہیں۔ جو فرد جماعت اسلامی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے دارالاسلام کی تاریخ کے اوراق کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی اور علامہ اقبال کا آپس میں کیسا فکری و قلبی لگاؤ تھا۔ ایک دوسرے سے خط و کتابت، مولانا مودودی کی علامہ اقبال سے تین ملاقاتیں، علامہ اقبال کا اس دارفانی سے رخصت ہونے سے قبل مولانا مودودی سے ملاقات کی شدید خواہش کا اظہار اس دوران کسی مجبوری کے سبب مولانا مودودی کا علامہ اقبال سے آخری ملاقات سے محرومی پر شدید رنج و غم کا اظہار کرنا، یہ دو عظیم ہستیوں کے باہمی قرب اور الفت و محبت کی بہترین تصویر ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے وقت مسلمانوں کو یقین تھا کہ یہ علاقہ بھی مسلم اکثریت کی بنا پر پاکستان کا حصہ بنے گا مگر بد قسمتی سے اسے ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا۔ مسلمانوں پر یہ فیصلہ بجلی کی کڑک بن کر گرا، جس کا صدمہ اب تک محسوس کیا جا رہا ہے۔

کتاب کے مؤلف جامع دینی و سیاسی فکر کی حامل ایک بڑی ہی علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ انہیں بہترین مربی و مزم کی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ کیریئر کا آغاز بطور لیکچرار کیا اور بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے بہت سی کتب تالیف کیں اور الحمد للہ یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ موصوف کی جانب سے ”دارالاسلام: ایک نظریہ“ ایک تحریک کے عنوان سے تالیف کردہ سیریز کی یہ پہلی کتاب ہے، جبکہ یہ سیریز کل چھ حصوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلا حصہ: زیر نظر کتاب دارالاسلام پٹھان کوٹ کے علاوہ دوسرا حصہ: دارالاسلام کے ہیرے، تیسرا: دارالاسلام کے موتی، چوتھا: ادارہ دارالاسلام جوہر آباد پانچواں: دارالاسلام تصاویر کے آئینے میں، اور چھٹا حصہ: دارالاسلام کے تابندہ ستاروں کی کہکشاں زیر تالیف ہیں۔ دعا ہے کہ وہ اس تاریخی ورثے اور قومی اثاثے ”ادارہ دارالاسلام“ کی خدمات پر مشتمل باقی ماندہ کتب کی امانت بھی نسل نو کو جلد منتقل کر سکیں۔

یہ کتاب اسلامی تحریکات، واعظین و مربیین، تعلیمی اداروں، لائبریریوں، مکتبہ جات اور خاص طور پر جماعت اسلامی کی تاریخ سے آگاہی حاصل کرنے والوں کے لیے یقیناً ایک خوبصورت اور لا جواب تحفہ ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔



# MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

## Surah At-Tawbah (9)

### سُورَةُ التَّوْبَةِ

Ayāt 38 to 42

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَتَأْتِلُتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرْضَيْتُمْ  
بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَنْفِرُوا  
يُعَذِّبُكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۖ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝  
إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ  
لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ  
الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَى ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَ  
جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۗ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ لَوْ كَانَ  
عَرَضًا قَرِيبًا وَ سَفَرًا قَاصِدًا لَاتَّبَعُوكَ وَلَكِنْ بَعَدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۗ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ  
اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝

Ayah 38:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَتَأْتِلُتُمْ إِلَى  
الْأَرْضِ ۖ

O believers! What is the matter with you that when you are  
asked to march forth in the cause of Allah, you cling firmly  
to 'your' land?

Although this clarification has already been made in Surah An-Nisā, it is important to revisit the point here. The Quran addresses the hypocrites using the phrase ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ —“O you who have believed,” since they too professed faith. Legally and outwardly, they were considered Muslims, despite their concealed hypocrisy.

أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ

**Do you prefer the life of this world over the Hereafter?**

This probing question invites deep self-reflection: while you profess belief in the Hereafter, your hesitation to engage in combat in the path of Allah implies that you are forsaking the Hereafter in favor of the fleeting gains of this worldly life.

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٩﴾

**The enjoyment of this worldly life is insignificant compared to that of the Hereafter.**

**Ayah 39:**

إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا

**If you do not march forth, He will afflict you with a painful torment and replace you with other people. You are not harming Him in the least.**

If you refuse to hold the banner of Allah's Deen, He will replace you with another nation to fulfill this purpose.

وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤٠﴾

**And Allah is Most Capable of everything.**

**Ayah 40:**

إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ

**‘It does not matter’ if you ‘believers’ do not support him, for Allah did in fact support him**

إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ

**When the disbelievers drove him out ‘of Mecca’ and he was only one of two. While they both were in the cave**

At that critical moment, they were only two: Muhammad ﷺ, the Messenger of Allah, and Hadhrat Abu Bakr As-Siddiq رضي الله عنه.



إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا

He reassured his companion, “Do not worry; Allah is certainly with us.”

When Hadhrat Abu Bakr رضي الله عنه saw the pursuing polytheists reach the entrance of the cave, he said, “O Messenger of Allah (ﷺ), they have reached as far as the mouth of the cave. If any of them looks down, we will be exposed.” The Prophet ﷺ reassured him, saying, “Do not worry; Allah is with us.”

فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا

So Allah sent down His serenity upon the Prophet, supported him with forces you ‘believers’ did not see

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ

And made the word of the disbelievers lowest

Thus, Allah, in His Divine support, aided His Prophet ﷺ, vanquishing the disbelievers and establishing the supremacy of His Deen across the Arabian Peninsula.

وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

While the Word of Allah is supreme. And Allah is Almighty, All-Wise.

Ayah 41:

إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا

‘O believers!’ March forth whether you are light or heavy

The terms “light” and “heavy” here encompass both the outward and inward states of individuals. One interpretation of this phrase is: whether you go forth reluctantly with heavy hearts or willingly with eagerness, you must proceed, as the matter of jihād has advanced beyond mere encouragement — it has now reached the stage of a general call to arms, making participation an individual obligation (*fardh ‘ayn*). Another interpretation is: whether you are well-equipped with provisions and weaponry or lacking in resources, you are required to march forth regardless.

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ  
تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾

And strive with your wealth and your lives in the cause of Allah. That is best for you, if only you knew.

Ayah 42:

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَاتَّبَعُوكَ وَلَكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ

Had the gain been within reach and the journey shorter, they would have followed you, but the distance seemed too long for them.

Had these hypocrites anticipated an easy acquisition of spoils or a nearby target, they would have surely joined you. However, the mere mention of the long journey to Tabūk has caused their hearts to sink.

It was the blessed practice of the Prophet ﷺ to keep the objectives and details of any expedition strictly confidential. When preparations for a campaign were announced, the destination and strategy would remain undisclosed. For instance, the plan for the conquest of Makkah was kept secret until the final moment. However, for the Battle of Tabūk, the Prophet ﷺ made an exception by openly announcing all details along with the order to prepare. He explicitly stated that the army's destination was Tabūk and that they would be confronting the Roman Empire. This transparency allowed each individual to thoroughly assess his readiness, both outwardly and inwardly — enabling him to gather the necessary provisions and equipment while also evaluating his resolve and determination for the expedition.

وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ

And they will swear by Allah, “Had we been able, we would have certainly joined you.”

This means they will repeatedly swear oaths, concocting excuses and lamenting their supposed constraints to justify their absence.

يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ

They are ruining themselves. And Allah knows that they are surely lying.

## Ayāt 43 to 60

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذْنَتْ لَهُمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَ تَعْلَمَ الْكَذِبِينَ ﴿٤٣﴾ لَا  
يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۖ وَ  
اللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿٤٤﴾ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ ارْتَابَتْ  
قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿٤٥﴾ وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً ۖ وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ  
انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٤٦﴾ لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا  
خَبَالًا ۚ وَلَا أَوْضَعُوا خِلَاكَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ فِيكُمْ سَاعُونَ لَهُمْ ۚ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ  
بِالظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾ لَقَدْ ابْتِغُوا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلِ وَ قَلَّبُوا لَكِ الْأُمُورَ حَتَّى جَاءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ أَمْرُ  
اللَّهِ وَ هُمْ كَرِهُونَ ﴿٤٨﴾ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَذْنَنْ لِي ۖ وَ لَا تَفْتِنِّي ۚ أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا ۚ وَإِنَّ  
جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿٤٩﴾ إِنْ تُصِيبَكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ إِنْ تُصِيبَكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا  
قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَ هُمْ فَرِحُونَ ﴿٥٠﴾ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا  
هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى  
الْحُسْنَيْنَيْنِ ۚ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمْ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۚ  
فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ ﴿٥٢﴾ قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَنْ يُتَقَبَلَ مِنْكُمْ إِلَّا نِكْمٌ  
كُنْتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٥٣﴾ وَ مَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَ  
بِرَسُولِهِ وَ لَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَ هُمْ كُسَالَى وَ لَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَ هُمْ كَرِهُونَ ﴿٥٤﴾ فَلَا  
تُعْجِبَكَ أَمْوَالُهُمْ وَ لَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ  
تَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٥٥﴾ وَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَبِئْسَ لَكُمْ ۚ وَ مَا هُمْ مِنْكُمْ وَ  
لَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُونَ مَلَجًا أَوْ مَغْرَبًا أَوْ مَدَّخَلًا لَوَلَّوْا إِلَيْهِ وَ هُمْ  
يَجْمَحُونَ ﴿٥٧﴾ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ ۚ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا ۚ وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا  
مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَ رَسُولُهُ ۚ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ  
سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَ رَسُولُهُ ۚ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿٥٩﴾ إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ  
الْمَسْكِينِ وَ الْعَبِلِينَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغُرَمِينَ وَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ  
ابْنِ السَّبِيلِ ۚ فَرِيضَةٌ مِنَ اللَّهِ ۚ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

Ayah 43:

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذْنَتْ لَهُمْ

May Allah pardon you 'O Prophet'! Why did you give them permission 'to stay behind'

That is, certain hypocrites approached you ﷺ with a fabricated excuse, seeking exemption from the expedition, and you, in your innate compassion and gentleness, granted them permission. This provided them with a pretext to claim that they had been excused by the Prophet ﷺ, even though they had no intention of participating in the first place. Consequently, the permission shielded their hypocrisy from being exposed. Had permission been denied, it would have revealed whether they genuinely intended to join the expedition. However, several hypocrites came forward with concocted excuses and were granted exemption by the Prophet ﷺ.

حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكِ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَذِبِينَ ﴿٤٣﴾

Before those who told the truth were distinguished from those who were lying?

Ayah 44:

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ

Those who believe in Allah and the Last Day do not ask for exemption from striving with their wealth and their lives.

True believers would never seek exemption from jihād in such circumstances, as they recognize it as an integral obligation of faith. Notably, in Surah Al-Hujurāt, ayah 15, the definition of *imān* includes both heartfelt conviction and jihād in the path of Allah as essential components. This principle has also been addressed earlier in Surah Al-Anfāl, ayāt 2 and 74, where jihād in the path of Allah has been unequivocally established as a fundamental requirement of true faith.

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿٤٤﴾

And Allah has perfect knowledge of those who are mindful 'of Him'.

Ayah 45:

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ

**No one would ask for exemption except those who have no faith in Allah or the Last Day, and whose hearts are in doubt**

Here, one should reflect on the words from Surah Al-Hujurāt: ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا (Al-Hujurāt 15) — “then they do not doubt,” which highlight that true believers are those who, after embracing faith, remain free from doubt. In contrast, the words from the ayah under discussion: وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ — “and their hearts were overcome by doubt,” clearly illustrate that these hypocrites are afflicted by persistent doubts and uncertainties firmly entrenched in their hearts.

فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿٥٠﴾

**So they are torn by their doubts.**

Plagued by doubts and uncertainties in their faith, they find themselves in a state of hesitation, unable to decide whether to join the jihād. At times, they perceive a benefit in accompanying the Muslims, fearing that staying behind might expose their pretense of faith. Yet, the thought of the exhausting journey overwhelms them, and the pull of worldly interests binds them like chains. Consequently, they resort to fabricating false excuses once more.

Ayah 46:

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً

**Had they ‘really’ intended to march forth, they would have made preparations for it.**

Such a long and arduous journey required thorough preparation, including securing ample provisions and arranging transportation. Yet, their complete lack of effort and idleness in making any preparations clearly reveal that they had no intention of joining the expedition from the very beginning.

وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقُعْدِيْنَ ﴿٥١﴾

**But Allah disliked that they should go, so He let them lag behind, and it was said ‘to them’, “Stay with those ‘helpless’ who remain behind.”**

The wisdom behind this command is elaborated upon in the following ayah:

**Ayah 47:**

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا

**Had they gone forth with you 'believers', they would have been nothing but trouble for you**

Since their hearts were afflicted with disease, even if they had joined the army, they would have only caused discord, engaged in conspiracies, and attempted to sow division among the Muslims. Thus, their staying behind and not accompanying you on the journey was, in fact, better. This underscores that for a true believer, everything from Allah is ultimately a source of goodness, while for a hypocrite, every situation results in loss and harm.

وَلَا أَوْضَعُوا خِلَافَكُمْ يَبْغُونَكُمْ الْفِتْنَةَ

**And would have scrambled around, seeking to spread discord in your midst.**

وَفِيكُمْ سُبُحُونٌ لَهُمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ

**And among you are their spies. And Allah has 'perfect' knowledge of the wrongdoers.**

An alternate interpretation is, “Among you are those who listen to them.” This means that among you are well-intentioned yet simple-hearted Muslims who hold a favorable opinion of the hypocrites. Such individuals maintain friendly ties with them and give undue attention to their words. Had these hypocrites joined the army and incited discord, it is very likely that these naive Muslims would have been swayed by the turmoil they intended to cause.

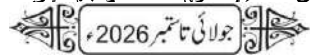
**Ayah 48:**

لَقَدْ ابْتَغُوا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ

**They had already sought to spread discord before**

It is worth noting that the term “*fitnah*” (discord) appears in a similar context in the hadith previously referenced in the explanation of ayah 34 regarding the behavior of corrupt scholars (*ulamā as-sū*):

((عاباؤهم بس من بحت — “Their scholars will be the worst أديم السيء، من عندهم حرج الفتنة وفهم تعود))



under the heavens; *fitnah* will emerge from them and return to them.” This signifies that such scholars will remain engaged in disputes, issuing conflicting fatwas, and fostering division. Similarly, O Prophet ﷺ, these hypocrites have never missed an opportunity to conspire against you.

وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ

**And devised every ‘possible’ plot against you ‘O Prophet’**

These individuals have spared no effort in attempting to undermine and disrupt your affairs.

حَتَّى جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَرِهُونَ ﴿٥٨﴾

**Until the truth came and Allah’s Will prevailed — much to their dismay.**

This signifies that, regardless of their wishes and efforts, Allah’s Deen ultimately gained dominance across the Arabian Peninsula.

**Ayah 49:**

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِّي وَلَا تَفْتِنِّي ط

**There are some of them who say, “Exempt me and do not expose me to temptation.”**

This refers to Jadd ibn Qays (لعنة الله عليه), one of the accursed hypocrites. When the Prophet ﷺ ordered preparations for the expedition to Tabūk, he approached seeking exemption, saying, “O Messenger of Allah! (عليه وسلم) excuse me from this campaign, for I am a man susceptible to temptation. The army is heading toward Syria, a land of exceedingly beautiful women. I fear I will be unable to restrain myself and will fall into sin. Spare me from this trial and allow me to stay behind.”

أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا ط

**They have already fallen into temptation.**

This signifies that this individual and his companions are already trapped in the gravest trial, as evidenced by their audacity to concoct such excuses. Their behavior reflects a mindset so deeply corrupted that it represents a *fitnah* far greater than any conceivable trial.

وَأَنَّ جَهَنَّمَ لَحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿٥٩﴾

And Hell will surely engulf the disbelievers.

Ayah 50:

إِنْ تُصِيبَكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ

If a blessing befalls you 'O Prophet', they grieve

If you ﷺ attain any success or receive good news, it greatly disturbs and displeases them.

وَإِنْ تُصِيبَكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ

But if a disaster befalls you, they say, "We took our precaution in advance,"

They arrogantly claim, "We are not as naive as these people. We carefully assessed the situation and took proactive measures to protect ourselves from such adverse circumstances."

وَيَتَوَلَّوْا وَهُمْ فَرِحُونَ

And turn away, rejoicing.

In such circumstances, they revel in their joy, delighted that misfortune has befallen the Muslims while they have managed to remain unaffected.

The next two ayāt are a powerful weapon for a believer in the event of a confrontation between truth and falsehood. Therefore, it is highly advisable for every Muslim to commit these ayāt to memory.

Ayah 51:

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا

Say, "Nothing will ever befall us except what Allah has destined for us. He is our Protector."

We are servants of Allah. Any hardship that befalls us does so only with His will and permission. Not even a single leaf in the universe can stir without His command. He is our Protector and Sustainer. If His Divine decree brings us a trial, we accept it wholeheartedly:

سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

We bow our heads in submission to whatever pleases the Beloved.

Whatever He wills, we are content with it. Even if a hardship comes from Him, it carries goodness for us:



ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

Whatever our Cupbearer pours is nothing but a manifestation of His grace.

To be struck down by the sword of the Beloved is, in itself, a supreme honor — one that we want no other to claim. Our necks stand ever ready, eager to embrace this noble blessing:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ  
سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

May it not be the fate of foes to fall by your blade,  
For the necks of friends still stand ready to meet your dagger's edge!

وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾

So in Allah let the believers put their trust.

Ayah 52:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا أَحَدَى الْحُسْنَيْنِ ۖ

Say, “Are you awaiting anything to befall us except one of the two best things: ‘victory or martyrdom’?”

The term الْحُسْنَيْنِ is the dual form of الْحُسْنَى, the feminine of أَحْسَن, a superlative form. Thus, الْحُسْنَيْنِ signifies “the two most excellent outcomes.” When a believer embarks on a mission in the path of Allah, both potential outcomes are supremely desirable. If he attains martyrdom, it is the highest honor:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن  
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!

For the believer, martyrdom is both the goal and the prize—  
Not treasures of war, nor the glory of conquest.

And if he returns victorious, that too is a glorious success. In either case, the believer triumphs — there is no third possibility. Why, then, should a believer fear anything?

جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر  
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

For those who live for truth, death brings no fear, O Jigar—  
When martyrdom calls, their hearts leap in joyous rhythm!

وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُّ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِندِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ

**“But We are awaiting Allah to afflict you with torment either from Him or at our hands.”**

We, too, await what will befall you—that Allah, due to your misdeeds, may send His punishment upon you directly, or that the time may come when we are granted permission to strike your necks ourselves.

فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ ﴿٥٧﴾

**“So keep waiting! We too are waiting with you.”**

**Ayah 53:**

قُلْ أَنفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّنْ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ إِنَّا كُنْتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٥٨﴾

Say, ‘O Prophet!’ “Whether you’ donate willingly or unwillingly, it will never be accepted from you, for you have been a rebellious people.”

This refers to the hypocrites’ ploy of offering some wealth or provisions as a donation, accompanied by excuses such as, “I am constrained by such-and-such reasons; I am unable to join personally, so grant me leave and accept this contribution.” In response, it is emphasized that now, with participation in jihād with one’s self having become an individual obligation (*fardh`ayn*), monetary contributions or provisions cannot substitute for this responsibility.

**Ayah 54:**

وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ

**And what prevented their donations from being accepted is that they have lost faith in Allah and His Messenger**

وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كُرْهُونَ ﴿٥٩﴾

**They never come to prayer except half-heartedly, and they never donate except resentfully.**

This means that the contributions they offer are not out of genuine commitment but rather an attempt to evade personal involvement. They

seek to have their provisions accepted so they may be excused from participating in the expedition.

**Ayah 55:**

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ط

**So let neither their wealth nor children impress you 'O Prophet'.**

Do not mistake their abundance of wealth and children as a sign of Allah's great favor upon them. On the contrary, Allah grants them these blessings to settle their account in this world, leaving nothing for them in the Hereafter. At times, these very blessings become a source of torment for them.

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

**Allah only intends to torment them through these things in this worldly life**

Allah may create circumstances where the very children a person lovingly raises with cherished hopes become a source of anguish for him. Likewise, the wealth amassed through immense effort and struggle may turn into a burden on his soul.

وَتَرْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ٥٥

**Then their souls will depart while they are disbelievers.**

Allah wills that such people remain deeply attached to their wealth and utterly absorbed in their love for their children, leaving them no opportunity to open their eyes to the truth. Thus, they persist in their heedlessness until they become deserving of the ultimate punishment.

**Ayah 56:**

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ط

**They swear by Allah that they are part of you**

They insist, "We too are Muslims, your allies; trust us," and make other similar assertions.

وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ٥٦

**But they are not. They only say so out of fear.**

In truth, these individuals are terrified of the prospect of Islam's dominance, and out of fear, they portray themselves as Muslims.

**Ayah 57:**

لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغْرَتٍ أَوْ مَدْخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴿٥٧﴾

**If only they could find a refuge, or a cave, or any hiding-place, they would rush headlong towards it.**

Much like a frightened animal that breaks free from its tether and flees, these individuals are overwhelmed by a state of panic. In their desperation, if they had found any refuge in the Arabian Peninsula or any safe haven to preserve their lives, they would have fled in terror without a second thought.

**Ayah 58:**

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ ۚ

**There are some of them who are critical of your distribution of alms 'O Prophet'.**

The wealth of zakāh and charity was personally distributed by the Prophet ﷺ. On one occasion, during the distribution, a hypocrite objected, saying: “يا محمد، اعدل” — “O Muhammad, be just [in your distribution]!” —implying that the Prophet ﷺ was acting unjustly. This audacity angered the Prophet ﷺ, and he replied:

((وَيْلٌكَ، وَمَنْ يَعْمَلْ إِذَا لَمْ أَكُنْ — “Woe to you! Who will be just if I am not [متفق عليه] اعدل...))

فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿٥٨﴾

**If they are given some of it they are pleased, but if not they are enraged.**

**Ayah 59:**

وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿٥٩﴾

**If only they had been content with what Allah and His Messenger had given them and said, “Allah is sufficient for us! Allah will grant us out of His bounty, and so will His Messenger. To Allah 'alone' we turn with hope.”**

Had these people adopted a positive mindset and thought well of Allah and His Messenger ﷺ, it would have been far better for them.

Now comes the well-known ayah that outlines the proper avenues for the distribution of zakāh.

**Ayah 60:**

إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا

**Alms-tax is only for the poor and the needy, for those employed to administer it**

The term *sadaqāt* here refers specifically to zakāh. The phrase ﴿وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا﴾ includes all personnel employed in the zakāh department, whether tasked with collecting zakāh, maintaining records, distributing it to rightful recipients, or serving in any other capacity. The salaries of all such employees are to be paid from the zakāh funds.

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ

**For those whose hearts are to be won over**

During the course of a religious movement or call to faith, zakāh funds may be used for *ta'liq al-qulub* — winning over the hearts of certain influential individuals in society. Offering them financial support can help reduce or neutralize their opposition. According to the *fuqahā* (Islamic jurists), this category is not applicable once the Deen is firmly established. However, in situations where such a need arises, zakāh funds may be allocated for this purpose.

وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرَمِينَ

**For 'freeing' slaves, for those in debt**

Zakāh funds may be utilized to assist a debtor unable to repay his debt or an individual burdened with a financial penalty, offering him the necessary relief and support.

وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ<sup>ط</sup>

**For Allah's cause, and for 'needy' travellers.**

This refers to the use of zakāh funds for endeavors such as jihād, da`wah, and the struggle to establish the Deen. However, it is essential to prioritize the most deserving recipients, including the poor, orphans, the needy, and widows who are genuinely in need. Only after addressing their

needs should any surplus zakāh funds be allocated to other religious initiatives.

فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٠﴾

‘This is’ an obligation from Allah. And Allah is All-Knowing, All-Wise.

The phrase ﴿فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ﴾ also appears in the context of inheritance rulings in Surah An-Nisā, ayah 11.

### Ayāt 61 to 66

وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۖ قُلْ أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ يُؤْمِنُ  
لِلْمُؤْمِنِينَ وَ رَحْمَةٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۖ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٥١﴾  
يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضَوْكُمْ ۖ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنَّ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٥٢﴾ أَلَمْ يَعْلَمُوا  
أَنَّهُ مَن يُّحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٥٣﴾ يَحْذَرُ  
الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ اسْتَهِزُّوْا إِنَّا اللَّهُ مُخْرِجُ مَا  
تَحْذَرُونَ ﴿٥٤﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَيَاللَّهُ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ  
تَسْتَهْزِءُونَ ﴿٥٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ إِنَّ نَعْفَ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ يُعَذِّبُ  
طَآئِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٥٦﴾

Ayah 61:

وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۖ

And there are others who hurt the Prophet by saying, “He listens to anyone.”

“He is all ears.” The intent behind this remark was to imply that he listens to everyone indiscriminately and accepts whatever excuses — true or false — they present, as if he lacks discernment (Allah forbid!). Such statements were made by the hypocrites to mock and insult the Prophet ﷺ, causing him distress.

قُلْ أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ

Say, ‘O Prophet,’ “He listens to what is best for you. He believes in Allah, has faith in the believers”

Here, note the distinct meanings created by the use of “ب” and “ل” with the verb **يؤمن**. When used with ب, the verb **يؤمن** signifies believing in

something, while with ل, it implies accepting or believing someone's words as true.

This highlights the nobility, grace, and forbearance of the Prophet ﷺ. Even though he knows you are lying, he chooses not to confront you or expose your deceit. Your folly lies in thinking you can deceive the Messenger of Allah ﷺ. You fail to comprehend the depth of his insight. He is the Messenger of Allah, while even the vision of an ordinary believer is such that it is illuminated by the light of Allah. The Prophet ﷺ said: ((اتقوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ)) [رواه البرمذی] — “Beware of the insight of the believer, for he sees with the light of Allah.”

وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ط

“And is a mercy for those who believe among you.”

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ١١

Those who hurt Allah's Messenger will suffer a painful punishment.

Ayah 62:

يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ ء

They swear by Allah to you 'believers' in order to please you,

During the preparations for this expedition, the hypocrites would fabricate false excuses to seek permission from the Prophet ﷺ to stay behind. They would then swear repeatedly, trying to convince the general Muslims of their sincerity, saying, “We are your loyal companions; do not doubt us.”

وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ١٢

While it is the pleasure of Allah and His Messenger they should seek, if they are 'true' believers.

Ayah 63:

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ذَٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ١٣

Do they not know that whoever opposes Allah and His Messenger will be in the Fire of Hell forever? That is the ultimate disgrace.

Ayah 64:

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ط

The hypocrites fear that a sūrah should be revealed about them, exposing what is in their hearts.

Since their hearts harbor deceit, they live in constant fear that Divine revelation may expose their lies.

قُلْ اسْتَهِزُّوْا إِنَّا لِلّٰهِ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾

Say, 'O Prophet!' "Keep mocking! Allah will definitely bring to light what you fear."

Ayah 65:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ط

If you question them, they will certainly say, "We were only talking idly and joking around."

The Prophet ﷺ is being informed that these hypocrites, who frequently engage in slander against you and the Muslims, will, if confronted about their behavior, immediately respond, "We were not speaking seriously; we were merely joking and engaging in lighthearted banter."

قُلْ أَيْلَهُمْ وَإِيَّتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ﴿٦٥﴾

Say, "Was it Allah, His revelations, and His Messenger that you ridiculed?"

So now, will Allah, His ayāt, and His Messenger ﷺ become the targets of your mockery: بازی بازی باریش بابا هم بازی! — "Will you make light even of the dignity of the elder's beard?"

Ayah 66:

لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ط

Make no excuses! You have lost faith after your belief.

إِنْ نَعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٦﴾

If We pardon a group of you, We will punish others for their wickedness.

The time is near when you will face the consequences of your transgressions. (To be continued)

[Note: The notation ' ' indicates the brackets ( ) in the translation]

\*\*\*